ماہنامہ محدّث بنارس

شمارہ/۲	محرم ۱۴۲۹ھ	فروری ۲۰۰۸ء	جلد/ ۲۶

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی۱۸/۱جی، ریوڑی تالاب

وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک

سالانہ ۱۲۰/ روپے

فی پرچہ ۱۲/روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔

اس شمارہ میں

نوٹ : ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

درس قرآن

نئے سال کا آغاز

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴾ (سورہ انفال:۳۰)

ترجمہ: (اور اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے) جب کہ کافر لوگ آپ کے بارے میں تدبیر سوچ رہے تھے کہ آیا آپ کو قید کرلیں یا آپ کو شہید کردیں یا آپ کو شہر بدر کردیں اور وہ لوگ تو اپنی تدبیریں کررہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کررہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

یہ آیت کریمہ اللہ کے رسول ﷺ کے واقعہ ہجرت کی یاد دہانی ہے، جب سرداران مکہ آپ کے بارے میں اس فیصلہ پر کاربند ہوئے کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک فرد آپ کی شہادت میں شریک ہو اور آپ کا خاتمہ کردیا جائے۔ تب اس وقت اللہ تعالی نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ آپ کو ان کفار کے اندوہناک پلان سے مطلع فرمایا، آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹا کران کے بیچ سے نکل کر غار ثور میں جا کر تین دن چھپے رہے، پھر اس کے بعد مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمایا، یہ ایک عظیم عبرت آمیز واقعہ ہے، ایک طرف مکہ والے آپ کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، دوسری جانب مدینہ میں لوگ دل وجان سے آپ کے استقبال کی تیاری میں تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسلامی سال کی بنیاد ڈالی تو سب کے مشورہ کے بعد اسی ہجرت کے واقعہ سے اسلامی سال کی شروعات کی۔

ماہ محرم اسلامی سال کا پہلا مہینہ اور ہر محرم الحرام نئے سال کا آغاز ہے، ہجری کیلنڈر کا ۱۴۲۹ واں سال شروع ہوچکا ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ نئے سال کے آغاز پر امت محمد یہ کا ایک طبقہ سوگ وماتم اور منہیات، بدعات وخرافات سے سال کی شروعات کرتا ہے، اور جس جذبۂ محبت اور جاں نثاری کے واقعہ سے اس ہجری کیلنڈر کو جوڑا گیا ہے، اس کو یک لخت نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

یہ ہجرت اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لئے تھی، ہم کو اس واقعہ سے نصیحت لیتے ہوئے اپنے ایمان وعمل کا محاسبہ کرنا چاہئے کہ ہماری زندگی کا ایک سال کیسے گذرا، ہم نے کیا کھویا، اور آگے کے لئے کیا محفوظ کیا۔

☆☆☆

درس حدیث:۱۱۰

بعض آداب دعاء

تحریر: مولانا عبد السلام مدنی / استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

عن سلمان، قال: قال رسول الله ﷺ: إن ربكم حي كريم، يستحيي من عبده إذا رفع يديه إليه أن يردهما صفرا. رواه الترمذي وأبوداود والبيهقي في الدعوات الكبير. (مشكاة ج ۱، ص ۱۹۵)

قال في المرعاة: وأخرجه أيضا أحمد وابن ماجه والحاكم. قال الترمذي: حديث حسن غريب. وقال الحافظ في الفتح: سنده جيد. (مرعاة ج ۷، ص ۳٦٤)

ترجمه: حضرت سلمان ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک تمہارا رب بہت حیاوالا کریم ہے (بے مانگے دینے والا ہے، یا بے انتہا داد ودہش کرنے والا ہے) جب اس کا کوئی بندہ (یا بندی) اپنے دونوں ہاتھ (دعاء کرتے ہوئے) اس کی جانب اٹھاتا اور پھیلاتا ہے تو اس بات سے وہ شرماتا ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی لوٹائے۔ (ترمذی، ابوداود......، حدیث حسن)

تشریح: دعاء مانگنی اور اللہ تعالی کا ذکر ہمہ وقت کرنا چاہئے، اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿أدعوا ربكم تضرعا وخفية ...... — الأعراف: ۵۵﴾ "تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو گڑگڑا کے بھی اور چپکے چپکے بھی"۔ (جوناگڈھی ؒ)

اورفرمایا: ﴿واذكر ربك في نفسك تضرعا وخفية ودون الجهر من القول بالغدو والآصال ولا تكن من الغافلين — الأعراف: ۲۰۵﴾ "اور اے شخص! اپنے رب کی یاد کیا کرا پنے دل میں عاجزی کے ساتھ، اور خوف کے ساتھ، اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام، اور اہل غفلت میں سے مت ہونا"۔ (جوناگڈھی ؒ)

حدیث پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ دعاء دونوں ہاتھ پھیلا کر مانگنی چاہئے، نیز ایسا کرنے سے رب العالمین خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ مسافر آدمی پریشانی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کرتا ہے مگر کھانا پینا اور لباس حرام کا ہونے کی وجہ سے اس کی دعاء قبول نہیں ہوتی ہے: "الرجل يطيل السفر ...... يمد يديه إلى السماء ...... الحديث" (مشکاۃ ج ا، ص ۲۴۱)

دعاء میں پھیلے ہوئے ہاتھ میں پھونک کر چہرہ اور جسم پر ملنے کا ثبوت بھی بخاری شریف کی روایت سے ہوتا ہے: "عن عائشة كان رسول الله ﷺ إذا أوى إلى فراشه نفث في كفيه ...... ثم يمسح بهما وجهه وما بلغت يداه من جسده ...... (بخاری مع الفتح ج ۱۰، ص ۲۰۹)

یعنی آپ ﷺ جب بستر پر آتے تو دونوں ہتھیلیوں میں سورہ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر پھونک لیتے پھر ہاتھوں سے چہرہ اور جسم کے ان حصوں پر مسح کرتے جہاں ہاتھ پہنچتے۔ ایسا آپ نے اپنی بیماری میں بھی کیا اور کرایا ہے۔

رب العالمین امت مسلمہ کو آداب دعاء سیکھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق مرحمت فرما، آمین۔ ☆☆☆

افتتاحیہ

دہشت گردی، تعریف، اسباب اور علاج

مدیر محدث جناب مولانا عبدالوہاب صاحب حجازی استاد جامعہ سلفیہ بنارس کا تحریر کردہ یہ مقالہ مارچ ۲۰۰۵ء کے دربھنگہ سیمینار میں پڑھا گیا تھا، قارئین کے استفادہ کے لئے اسے محدث میں شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارۂ محدث)

دہشت گردی انگریزی لفظ "Terrorism" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی میں ظلم، انتہا پسندی، تشدد و جارحیت اور ناجائز قتل وسلب وغیرہ بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، عربی میں اس کے لئے لفظ ''ارھاب'' وضع کیا گیا ہے جو مروج اصطلاحی معنی میں بالکل نیا ہے، عربی معاجم ارھاب اور ارھابی کی اصطلاحات سے خالی ہیں، البتہ ان دونوں مصطلح الفاظ کا اصل مادہ رھب رھبۃ ورھبانا، ڈرا اور ارھب ارھابا ڈرایا کے معنی میں عربی لغت میں آیا ہے، اسی طرح قرآن وسنت بھی ارہاب کے جدید اصطلاحی معنی سے پاک ہیں، قرآن مجید کی آیت کریمہ ﴿ترھبون به عدو الله وعدوكم﴾ (الانفال:۶۱) سے ایسی تخویف مراد ہے کہ سامان حرب کی تیاری دیکھ کر اللہ اور اہل ایمان کے دشمن حملہ اور سرکشی کی ہمت نہ کرسکیں، یہ مفہوم ظلم وجارحیت سے بالکل پاک ہے، رہبت کا لفظ قرآن مجید میں خشیت کے معنی میں تھوڑے فرق کے ساتھ آیا ہے، رہبت ایسے خوف کو کہتے ہیں جو بھاگنے کا نتیجہ دے یعنی جس خوف کے ساتھ عمل بھی ملا ہوا ہو جب کہ خشیت ایسے خوف کو کہتے ہیں کہ جس سے ڈرا جائے اس کی عظمت اور کمال اقتدار کے علم پر مبنی ہو، خوف، خشیت اور رہبت اگر عاجزی، تابع داری اور محبت پر مبنی ہو تو یہ اللہ کے لئے خاص اور توحید الوہیت وعبادت ہے اور عبادت قلبی کی نہایت مہتم بالشان قسم ہے، اس قسم کا خوف غیر اللہ کے لئے رکھنے والا اگر بے توبہ کے مرجائے تو مخلد فی النار رہوگا، کفار ومشرکین اپنے بتوں سے ایسا ہی خوف رکھتے ہیں۔ ھداھم الله - رہبان اور رہبانیت کا لفظ بھی قرآن مجید میں آیا ہے یعنی مبتدعانہ رہبانیت جو عبادت میں غلو اور پھر کفر وشرک تک پہنچ کر خالص اللہ کے خوف سے عاری ہوگئی۔

الغرض اللہ سے ڈرنا دین توحید اسلام کا طرۂ امتیاز اور موحدین مسلمین کی زندگی کا محور ہے، اللہ نے قرآن مجید میں مومنین موحدین کو اپنے آپ سے ڈرایا ہے، جہنم کے عذاب سے ڈرایا ہے کہ وہ ظالموں، نافرمانوں، مشرکوں اور دہشت گردوں کا ٹھکانہ ہے، موت سے ڈرایا ہے کہ موحد زندگی میں امن وسلامتی کی راہ اپنائے، جو موحدین اللہ سے ڈرتے ہیں ان

کی دنیاوی زندگی امن وسلامتی اور عدل وانصاف کا تر از وہوتی ہے، اس کے علی الرغم جولوگ اللہ سے کم ڈرتے یا بالکل نہیں ڈرتے وہ لازماً دنیا کی دیگر اشیاء سے ڈرنے لگتے ہیں، کفار ومشرکین کو دیکھ کر خالق سے نہیں ڈرتے مگر اس کی مخلوق شمس وقمر سے ڈرتے ہیں وہ دریاؤں اور پہاڑوں سے خوف کھاتے ہیں انہیں دنیا کے سب سے پر امن مقدس مقامات مساجد اور مدارس سے خوف آنے لگتا ہے، جہاں امن وامان اور عدل وانصاف کے سوا کوئی اور سبق پڑھایا ہی نہیں جاتا، اللہ کے خوف سے آزاد ہوکر انسانی فکر وفہم کا پیمانہ بالکل الٹ جاتا ہے۔

نوع انسانی کا اصل دین توحید اور اللہ کا خوف ہے، آدم سے لیکر نوح تک دس صدیاں دین توحید واسلام کی صدیاں ہیں، پھر انسان نے کائنات کے سب سے بڑے ظلم شرک کا ارتکاب کیا اور اس کے بعد سے انسانی زندگی طرح طرح کے ظلم وطغیان کا شکار ہوگئی، تمام انبیاء ورسل اللہ کی توحید اور اس کے خوف کا درس دینے کے لئے دنیا میں آتے رہے اور یہ سلسلہ خاتم النبیین جناب محمد ﷺ پر ختم ہوا لیکن اللہ کے خوف سے آزاد ہوکر کفر وشرک کرنے والوں نے ظلم وطغیان کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جھونکا، کبھی پر امن موحدوں کی نرینہ اولاد کا فرعون مصر نے قتل عام کیا اور ظالم ودہشت گرد بنو اسرائیل نے کتنے انبیاء کوموت کے گھاٹ اتارا اور کتنے موحدین کو آروں سے چیر ڈالا اور اصحاب الاخدود کفار ومشرکین نے بے گناہ مسلمانوں کو دہکتی آگ میں جھونک دیا، اور دنیا کے سب سے بڑے خانۂ توحید بیت اللہ الحرام مکہ کے بت پرست متولیان قریش نے نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے ساتھ ظلم وبربریت اور دہشت گردی کی وہ کارروائیاں کیں جس سے آپ اور آپ کے اصحاب کو مکہ شہر چھوڑ دینا پڑا اور مدینہ جانے کے بعد بھی بدر واحد کے بعد احزاب کی خوفناک جنگ کا سامنا آپ اور آپ کے اصحاب کو کرنا پڑا، غرض کفار ومشرکین کی طرف سے ہر دور میں اہل توحید کو دہشت گردی کا سامنا رہا اور آج بھی سارے عالم میں دعوت الی اللہ کے حاملین ہر نوع کی دہشت گردی کے مصائب جھیل رہے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ رہبت اور ارہاب کے معنی قرآن مجید میں نہایت درجہ پاکیزہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وإياي فارهبون﴾ (البقرة: ۴۰) یعنی صرف مجھ سے ڈرو۔ یہ توحید الوہیت ہے یہی تمام انبیاء اور تمام مومنین کا دین رہا ہے، ہر دور میں اہل ایمان وتوحید کے خلاف کفار ومشرکین نے دہشت گردانہ کارروائیاں کی ہیں، تاریخ کا سینہ جس سے معمور ہے، جدید دور میں اسلامی دہشت گردی اور عربی میں ''ارہاب'' کا لفظ پوری دنیا میں استعمال ہورہا ہے، ان اصطلاحات کا اسلام جیسے پاکیزہ دین سے کوئی واسطہ نہیں، قضیہ فلسطین کو اپنے حق میں کرنے کے لئے یہ یہود کا باطل پروپیگنڈہ ہے جس کی تائید امریکی خارجہ پالیسی اور جدید گلوبل ازم کر رہا ہے، ایک طرف نصف صدی سے فلسطینی قوم اپنی زمین اور وطن سے بے دخل خانماں

برباد ہے، دوسری طرف غاصب یہود ہیں جوانہیں ان کے گھروں سے نکال کر وہاں آباد ہو رہے ہیں، فلسطینی اگر آزادی وطن کے لئے جہاد کرتے ہیں تو یہود اسے اسلامی دہشت گردی اور ''ارہاب'' کا نام دیتے ہیں، اسی پس منظر میں ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک کا عالمی تجارتی مرکز تباہ کیا گیا جس کے دہشت گرد معلوم نہیں اتنا بالیقین معلوم ہے کہ اس روز ہزاروں یہودی اس مرکز میں کام پر نہیں آئے تھے، اس دہشت گردانہ واقعہ کے بعد اسلامی دہشت گردی اور ارہاب کا زبردست پروپیگنڈہ ہوا، اسلام جیسے پرامن اور فطری مذہب سے دنیائے انسانیت جوقریب تر آرہی تھی اس پروپیگنڈہ کے طوفان میں الجھ گئی اور پوری مسلم امت کو کرۂ ارض پر بسنے والی نوع انسانی کی نظر میں بزعم خویش دہشت گرد بنادیا گیا، اتنا ہی نہیں بلکہ دہشت گردی کے سائے ساری دنیا میں عموما اور عالم اسلام میں خصوصا نہایت گھنے اور تاریک تر ہوتے چلے جارہے ہیں، بوسنیا، کوسووو، چیچنیا، افغانستان، عراق اور فلسطین کی تباہی وبربادی کے بعد اور نہ جانے کون کون سے مسلم ممالک اپنی بربادی کے انتظار میں ہیں۔

سارے عالم کے اہل علم وسیاست اس جدید عالمی دہشت گردی کی تشخیص وتعریف کے لئے کوشاں ہیں، الگ الگ رجحانات ونظریات کی بناپر تعریف میں یکسانیت نہیں پیدا ہورہی ہے، اس لئے ہم ذیل میں دہشت گردی کی اسلامی تعریف پیش کررہے ہیں جسے اسلامی فقہ اکیڈمی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سولہویں اجلاس جنوری ۲۰۰۲ء میں دنیا بھر کے سربرآوردہ فقہاء اسلام نے پیش کی ہے۔

''دہشت گردی: مختلف افرادیا جماعتوں یا حکومتوں کی طرف سے کسی انسان پر ظلم وستم اور جارحانہ سرگرمیوں کو کہتے ہیں جس سے انسانی جان ومال اور اس کے دین وعقیدہ کو خطرہ لاحق ہو، دہشت گردی کے ضمن میں تشدد، خوف وہراس، ایذا رسانی بلاسبب قتل اور انسانی جان کے ضائع کئے جانے کی دھمکیاں بھی شامل ہیں، اسی طرح دشمنی میں کسی کو خوفزدہ کرنا، ڈاکہ اور رہ زنی کی واردات، شدت پسندانہ سرگرمیاں، اور لوٹ مار کی وہ تمام شکلیں دہشت گردی میں شمار کی جائیں گی جو مجرمین سے انفرادی یا اجتماعی طور پر سرزد ہوں اور اس مقصد کے لئے لوگوں میں مجرموں کا رعب ودبدبہ طاری کرنا جس سے جان ومال، امن وسلامتی، انسانی زندگی اور اس کی آزادی کو خطرہ لاحق ہو، اسی طرح معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرنا جس سے جان ومال، امن وسلامتی، انسانی زندگی اور اس کی آزادی کو خطرہ لاحق ہو، اسی طرح معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کرنا جس سے لوگوں میں بے چینی یا توڑ پھوڑ کرکے فتنہ وفساد، املاک وجائدادنجی یا قومی اسباب ووسائل، قومی سماجی نفع بخش اور مصنوعی وطبعی وسائل کی تباہی کا خطرہ ہو۔

بنابریں روئے زمین پر فتنہ وفساد کی وہ تمام شکلیں دہشت گردی کے دائرے میں آتی ہیں جس سے اللہ تعالی نے اپنے کلام پاک میں شدت کے ساتھ مسلمانوں کو منع کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿ولا تبغ الفساد فی الأرض إن الله لا یحب المفسدین﴾ (القصص:۷۷)
اورزمین میں فساد مت برپا کرو، یقیناً اللہ فتنہ گروں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے فتنہ وفساد،ظلم وزیادتی، تشدد وانتہاپسندی اور دہشت گردی کی عبرت ناک سزا متعین کی ہے اورقرآن مجید اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ وجدل کے مترادف مانتا ہے، ارشاد باری ہے:

﴿انما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله ویسعون فی الأرض فسادا أن یقتلوا أو یصلبوا أو تقطع أیدیهم وأرجلهم من خلاف أو ینفوا من الأرض، ذلك لهم خزي فی الدنیا، ولهم فی الآخرة عذاب عظیم﴾ (المائدۃ:۳۳)

جو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں، ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کردیئے جائیں یا سولی چڑھادیئے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کردیا جائے یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت وخواری اورآخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب ہے۔

دنیا کے کسی قانون اورضابطہ میں اس جرم کی سنگینی کے پیش نظر اتنی سنگین اوردردناک سزا مقرر نہیں کی گئی جیسی اسلام نے متعین کی ہے،شریعت اسلامیہ نے اس سنگین جرم کو حدود اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ قرار دیا ہے۔

اکیڈمی کی نظر میں دہشت گردی کی متعدد قسموں میں سرکاری دہشت گردی اس کی بدترین قسم ہے اوراس کی واضح ترین مثالوں میں یہودیوں کی طرف سے فلسطین میں جاری دہشت گردی شامل ہے، اسی طرح بوسنیا،کوسووو اورچیچنیا میں ہلاکتوں کا سلسلہ بھی سرکاری دہشت گردی میں شمار کیا جائے گا، فقہ اکیڈمی ان تمام شکلوں میں جاری تشدد کو امن عالم اورانسانی سلامتی کے لئے خطرہ قرار دیتی ہے اوراس سے مقابلہ کو تحفظ جان کے لئے دفاع اور جہاد فی سبیل اللہ سمجھتی ہے۔(اعلان مکہ:۲۴،۲۵)

اسلامی دہشت گردی کا پروپیگنڈہ کرنے والوں نے اسلامی جہاد کو بطور دلیل پیش کیا ہے، اور جس طرح انہوں نے لفظ ''ارہاب'' کے پاکیزہ معانی کے ساتھ ظلم وتعدی اورقتل ونہب کے معانی کونہایت مکر کے ساتھ مخلوط کرکے سارے عالم میں اس کا پروپیگنڈہ کیا ہے لفظ جہاد کو خود ساختہ اصطلاح ارہاب کے ساتھ شامل کرکے اسلامی دہشت گردی کا مکارانہ باطل پروپیگنڈہ کیا ہے، حالانکہ خالق کائنات نے اسلامی جہاد کو دنیا میں قیام امن کے لئے مشروع فرمایا ہے جبکہ دہشت گردی اورظلم وفساد کو ممنوع قرار دیا ہے، جہاد اس لئے مشروع ہے کہ اس سے حق کی تائید ہو،ظلم وزیادتی کا دفاع ہو، امن وسلامتی اورعدل وانصاف کا قیام ہو،فقہ اکیڈمی کے بقول ''جہاد اس لئے مشروع ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس رحمت وشفقت سے اہل جہاں بہرہ ور

ہوسکیں جس کے لئے اللہ تعالی نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ لوگوں کو جہالت کے تنگ وتاریک راستہ سے نکال کر اسلام کی روشن شاہراہ پر گامزن کرسکیں اور اس کے ذریعہ دہشت گردی اپنی تمام شکلوں میں ختم ہوسکے، عوام کو ان لوگوں سے تحفظ مل سکے جو دوسروں کی زمین اور وطن پر ناجائز قابض ہونا چاہتے ہیں، لوگوں کے مال ومتاع اور قومی املاک کو غصب کرنا چاہتے ہیں، جہاد ان کے خلاف بھی مشروع ہے، جو افراد واقوام کے درمیان عہد شکنی اور بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو فتنہ وفساد اور ضرررساں اعمال سے چھٹکارا دلانے کی جد وجہد بھی جہاد میں شامل ہے، ان لوگوں کے خلاف بھی جہاد مشروع ہے جہاں اسلامی تعلیمات کی اشاعت وبیداری پیدا کرنے کی آزادی نہ ہو، اسلامی جہاد کے آداب واحکام میں یہ داخل ہے کہ جنگ میں شامل نہ ہونے والوں، بے گناہ لوگوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا حرام ہے، جو بھاگ جائے یا ہتھیار ڈال دے یا خودسپردگی کردے، یا پناہ گزیں ہوں ان کا قتل بھی حرام ہے، قیدیوں کو اذیت دینا، مقتولین کے ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قومی املاک، دفاتر، مکانات، عوامی نفع بخش چیزوں کی تباہی وبربادی حرام ہے، تشدد آمیز کارروائیوں کے سرغنہ وہ دہشت گرد جو لوگوں کے وطن غصب کرتے، انسانی عزت واحترام سے کورے اور مقدس مقامات کی بے حرمتی کے مجرم ہیں ان میں اور ان لوگوں میں جو قانونی حقوق کے حصول اور اپنی خودمختاری کی راہ میں مصروف جہاد ہیں زمین وآسمان اور حق وباطل اور جائز جہاد اور باطل دہشت گردی کا فرق ہے، اسلامی فقہ اکیڈمی اقوام عالم بین الاقوامی اداروں اور تنظیموں کو ظلم وتشدد کے خاتمہ کے لئے آواز دیتی ہے کہ مشروع جہاد اور ظالمانہ دہشت گردی کے درمیان حد فاصل قائم کریں اور اس سرکاری دہشت گردی کو ختم کرائیں جو ارض فلسطین پر جاری ہے۔ (اعلان مکہ ملخصا ص ۲۹، ۳۲)

غرض یہ کہ اسلامی دہشت گردی کا پروپیگنڈہ استعماری طاقتوں کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کا ایک باطل ہتھکنڈا ہے، اسلام انسان کے عزت واحترام کو کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿ولقد كرمنا بنى آدم وحملناهم في البر والبحر﴾ (الاسراء:۷۰) رسول رحمت محمد ﷺ نے فرمایا: لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأسود على أحمر ولا لأحمر على أسود الا بالتقوى. اسلام کی نظر میں سبھی انسان برابر ہیں، ان کی عزت واحترام میں کوئی فرق نہیں ہے، انسانیت کی سربلندی اسی وقت ممکن ہے جب بلند اقدار کو تحفظ حاصل ہو، جن میں سرفہرست عدل وانصاف اور اللہ تعالی کی نازل کردہ کتابوں کی سچی تعلیمات کے مطابق ایک دوسرے کا احترام شامل ہے، تمام انبیاء جس کی تعلیم دیتے رہے اور اللہ کے آخری نبی ورسول محمد ﷺ کو تو اللہ تعالی نے تمام اقوام وملل کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے قرآن مجید میں ہے: ﴿وما أرسلناك الا رحمة للعالمين﴾ (الانبیاء:۱۰۷) اس احترام کے

تقاضہ میں اسلام نے اسلامی حکومت میں غیر مسلم کی جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی ضمانت لی ہے، لہذا اسلام میں دہشت گردی، تشدد، انتہاپسندی نام کی کوئی چیز نہیں جسے اس کے علم کا شوق ہوا سے قرآن اور سنت کا مطالعہ کافی ہے، اسلام دہشت گردی کے بجائے، عدل وانصاف عفوودرگذر، باہمی گفت وشنید، عام انسانوں کے درمیان تعلقات اور آپسی رواداری پر زور دیتا ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿ولا تعتدوا ان الله لا یحب المعتدین﴾ (البقرہ:۱۹۰) اور سرکشی مت کرو، اللہ سرکشی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، ایسی روشن اور پاکیزہ تعلیمات کے باوجود دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑنے والے اگر انصاف عالم پر نظر ڈالتے اور انسانیت کے سچے بہی خواہ ہوتے تو انہیں اسلامی دہشت گردی سے پہلے، یہودی دہشت گردی، نصرانی دہشت گردی، ہندو دہشت گردی، بدھسٹ دہشت گردی، کمیونسٹ دہشت گردی، سرمایہ دارانہ دہشت گردی اور کنفیوشش دہشت گردی کی اصطلاحات وضع کرنی چاہئے تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں۔

(جاری)

☆☆☆

اسلامی سیاست میں رعایا کے لئے فکرمندی

ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

اسلام کے نظامِ سیاست پر گفتگو نئی نہیں، علمائے اسلام نے قرآن کریم کی تفسیر اور حدیث شریف کی شرح کی ذیل میں سیاست کے موضوع پر مکمل روشنی ڈالی ہے، اور تدوین کا دور شروع ہونے پر اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، محدثین ومجتہدین اسلام نے سیاسی موضوع کے تنوع کے سبب اصول پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے، اور فقہائے اسلام نے ہر کلیہ کی تفصیل اور ہر حکم کے آثار وفوائد بھی ذکر کئے ہیں۔

سیاست کا دائرہ وسیع ہے، زندگی کا کوئی شعبہ اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا، ہاں بعض شعبوں کا تعلق کم اور بعض کا زیادہ ضرور ہے، یہ سمجھنا کہ سیاسی معاملات کا دین سے تعلق نہیں، یا دین سیاست ہی میں محصور ہے، امر واقعہ کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔ اسلام اللہ تعالی کا بھیجا ہوا دین ہے، لہذا ممکن نہیں کہ انسان جس مسئلہ میں رہنمائی کا محتاج ہو اس میں اسلام خاموش ہو۔ ہمارے سامنے رسول اکرم ﷺ کی ۲۳ سالہ مبارک زندگی اور آپ کا اسوۂ حسنہ ہے، ہم غور کریں تو اس میں ہمیں یہ رہنمائی یقیناً مل جائے گی کہ زندگی کے کس مسئلہ کو کس مقام پر رکھا جائے، مگر افسوس ہے کہ انسان رائے اور نظریہ پہلے طے کر لیتا ہے، پھر اسلام اور کتاب وسنت سے اس کے لئے تائید وسند تلاش کرتا ہے!

ہم غور کریں تو واضح ہوگا کہ سیاست کے مسئلہ میں رہنمائی کی کمی سے الجھاؤ نہیں پیدا ہوا ہے، بلکہ ایمان وضمیر کا بنیادی عنصر ہماری زندگی سے نکل گیا ہے اس لئے ہمیں مشکلات کا سامنا ہے، کردار کی ناہمواری سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے ہم رہنما اصولوں میں کمی کے باعث رونما ہونے والا خلل سمجھتے ہیں!

☆ حکومت ایک اعلی اور با اختیار ادارہ ہے، اس کے لئے مشورہ کا تصور تو ہو سکتا ہے، لیکن رعیۃ میں اس کی طرف سے بے اطمینانی، احساسِ مظلومیت یا شکایت دلیل ہے کہ یہ ادارہ عوام کا اعتماد کھو چکا ہے۔

سیاست کے شعبہ میں خلل کا ایک سبب یہ ہے کہ والی وحاکم کا فرض ہے کہ با صلاحیت افراد کو کام پر متعین کرے، اگر اس نے با صلاحیت شخص کے ہوتے ہوئے کسی نا اہل کو یا کم اہلیت والے شخص کو کوئی ذمہ داری دے دی تو یہ اللہ اور رسول کی خیانت ہوگی۔ (السیاسۃ الشرعیۃ ص ۵)

جب یہ ثابت ہے کہ زیادہ صلاحیت والے شخص کو ذمہ داری سونپی جائے گی تو ایسے شخص کی پہچان ضروری ٹھہری، اور اس کے لئے معیار دین ہوگا، جیسا کہ اسوۂ نبوی سے ثابت ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ کہتے ہیں کہ بادشاہوں کا مقصود جب دنیا ہوگئی تو انہوں نے اسی کے مطابق والی مقرر کرنا شروع کیا، اور دین کی ترجیح ختم ہوگئی، لیکن عصر نبوی اور خلافت راشدہ میں ہم کو جو نمونے ملتے ہیں ان سے دین کو مقدم کرنے کی تائید ہوتی ہے۔

ابن تیمیہ آگے لکھتے ہیں کہ اگر دین کی اصلاح کا مقصد فوت ہوجائے تو یہ کھلا خسارہ ہوگا، اس کے بعد دنیا کی ترقی اور نعمتیں کچھ مفید نہ ہوں گی۔ عمال کی دینی ذمہ داری حضرت عمر کے اس قول سے واضح ہوتی ہے کہ: انما بعثت عمالی الیکم لیعلموکم کتاب ربکم وسنة نبیکم، ویقسموا بینکم فیئتکم. یعنی میں عمال کو اس لئے بھیجتا ہوں کہ تم کو کتاب وسنت کی تعلیم دیں، اور غنیمت وغیرہ مال کو تقسیم کریں۔

لیکن جب رعایا اور حکام میں تغیر پیدا ہوگیا، تو معاملات میں ٹکراؤ ظاہر ہوا، پھر بھی اگر حاکم ممکنہ حد تک دین ودنیا دونوں کی اصلاح کی کوشش کرے تو اسے اپنے زمانہ کا افضل شخص مانا جائے گا، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ انصاف کرنے والے امام کو عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ ملے گی۔ (السیاسۃ الشرعیۃ ص ۱۷ومابعد)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک قول میں والی وحاکم کی صفت کو بذریعہ مثال واضح کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گورنروں کے تقرر پر رعایا کی بہی خواہی اور ذمہ داری کو سوچنے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ:

وهكذا قال رجل لعمر بن الخطاب: يا أمير المؤمنين! لو وسّعت على نفسك في النفقة من مال الله تعالى ؟ فقال له عمر: أ تدري ما مَثَلي ومَثَل هؤلاء ؟ كمثل قوم كانوا في سفر، فجمعوا منهم مالا، وسلّموه الى واحد ينفقه عليهم، فهل يحل لذلك الرجل أن يستأثر عنهم من أموالهم؟ (السياسة الشرعية ص ٢٥)

یعنی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ کے مال سے اپنے اوپر آپ وسعت کریں تو مضائقہ نہیں، عمر نے اس سے کہا کہ: جانتے ہو میری اور ان کی مثال کیا ہے؟ یہ ان مسافروں کی طرح ہے جنہوں نے مال جمع کرکے ایک شخص کے حوالہ کردیا کہ ان پر خرچ کرے، تو کیا ایسے شخص کے لئے جائز ہوگا کہ یہ مال اپنے لئے خاص کرلے؟

خلیفہ کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے ماوردی نے لکھا ہے کہ: ان کی تعداد کل دس ہے:

اول دین واصول دین کا تحفظ، اگر بدعت یا شک وشبہ کا شکار کوئی آدمی موجود ہو تو اس کے سامنے دلیل پیش کرنا اور صحیح بات واضح کرنا، اور حقوق وحدود اس پر نافذ کرنا۔

دوم جھگڑے اور نزاع کی صورت میں شریعت کا حکم نافذ کرنا تا کہ انصاف عام ہو، نیز ظالم کا جبر اور مظلوم کی بے بسی ختم ہو۔

سوم ملک اور عزت وآبرو کا تحفظ تا کہ ضرورت پر لوگ بے خوفی کے ساتھ سفر پر نکل سکیں۔

چہارم: حدود قائم کرنا تا کہ شریعت کا تحفظ ہو سکے۔

پنجم: سرحدوں کا تحفظ تا کہ دین کے دشمن مسلم علاقوں اور وہاں کے باشندوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔

ششم: دشمنوں سے جہاد کرنا ان کو دعوت دینے اور جزیہ کا مطالبہ کرنے کے بعد۔

ہفتم: غنیمت اور صدقات کو خوف اور ظلم کے بغیر جمع کرنا۔

ہشتم: عطیات کا اندازہ کر کے مناسب وقت پر انہیں تقسیم کرنا، اور اسراف وبخل سے بچنا۔

نہم: امانت دار وخیر خواہ لوگوں کو ذمہ دار بنانا تا کہ تمام کام صحیح طور پر انجام دیئے جائیں اور اموال محفوظ رہیں۔

دہم: امام بذات خود معاملات کی نگرانی اور حالات کا تتبع کرے تا کہ امت کی سیاست اور ملت کی حفاظت کا کام انجام پا سکے، اس ذمہ داری کو لذت یا عبادت میں پڑ کر کسی اور کے حوالہ نہ کرے، ممکن ہے امین خیانت کر جائے، اور خیر خواہ دھوکہ دے جائے۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۸)

صاحب اقتدار کے پاس لوگ ضرورتیں لیکر آتے ہیں، ان کو پورا کرنا بھی والی وقائد کی ذمہ داری ہے، امام ابن تیمیہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

اگر ضرورت مند حاجت لیکر آئے اور اس کا پورا کرنا ممکن نہ ہو تو نرم بات کہے۔ عام طور پر لوگ والی کے پاس منصب، مالی مدد، منفعت، اجرت یا شفاعت کے سوال کے لئے آتے ہیں، اگر اس طرح کی ضرورت وہ پوری نہ کر سکے تو مناسب بات کہہ کر واپس کرنا چاہئے۔ یہ بھی قائد وذمہ دار کی سیاست کا ایک حصہ ہے، حق بات قبول کرنے پر انسان کی طبیعت اس وقت زیادہ آمادہ ہوتی ہے جب اسے اس میں اپنا کوئی فائدہ یا لذت نظر آتی ہے، انسان کو عبادت سے قریب کرنے کے لئے فائدہ کی کوئی جائز چیز پیش کی جائے گی تو اس پر بھی ثواب ملے گا، جس طرح کھانے پینے اور لباس کے سلسلہ میں حدیث میں آیا ہے کہ ان کی فراہمی پر بندے کو اجر ملے گا۔ جان بچانے کے لئے مردار کھانے کی جو اجازت ہے اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ (السیاسۃ الشرعیۃ ص ۱۰۶)

قائد کی ذمہ داری کا ایک اہم حصہ یہ ہے کہ وہ مالیات اور خاص طور پر بیت المال کی آمد وخرچ پر نظر رکھے، ایسا نہ ہو کہ کارکن حضرات ملت کی رقم میں خرد برد کریں۔

قائد پر ملت کے مفاد سے متعلق اقدامات کس حد تک ضروری ہیں اس کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ملت کی ضرورت کے مطابق مختلف پیشہ وروں سے کام لینا اس کی ذمہ داری ہے۔قوم کے لوگوں کو اگر غلہ، کپڑے اور مکانات وغیرہ کی ضرورت ہوگی تو ان پیشوں کے جاننے والوں کو مجبور کر کے ان سے کام لیا جائے گا تاکہ ملت کی ضرورت پوری ہو۔(الحسبۃ ص ۲۴)

شعر میں بات مختصر اور مؤثر طور پر آجاتی ہے، خلیفہ مامون کی ذمہ داری وفکرمندی کی تصویر پیش کرتے ہوئے اس کے وزیر محمد بن یزداد نے درج ذیل دوشعر پڑھے تھے:

من كان حارس دنيا انه قمِن　　　ان لا ينام، وكل الناس نُوّامُ

وكيف ترقدُ عينا مَنْ تضيّفَه　　　همّان من أمره، حل وابرام؟

یعنی دنیا کے محافظ کے لئے ضروری ہے کہ جب سب لوگ سوئے رہیں تو وہ بیدار رہے۔

ایسے شخص کی آنکھوں میں کیسے نیند آسکتی ہے، جس کے میزبان حل وابرام کے دو غم ہوں؟ یعنی جسے ہمیشہ معاملات کے تصفیہ کی فکر ہو۔

خلیفہ کے بعد الاحکام السلطانیۃ میں امام کے اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے، ماوردی لکھتے ہیں:(ترجمہ)

امام کے لئے معتبر شرطیں سات ہیں:

اول عدالت اپنی جامع شرطوں کے ساتھ۔

دوم علم جس کے ذریعہ پیش آمدہ مسائل واحکام میں اجتہاد کر سکے۔

سوم زبان، آنکھ اور کان کی سلامتی تاکہ ان کے ذریعہ ذمہ داری کے ساتھ اپنے کام انجام دے سکے۔

چہارم اس کے اعضاء میں ایسا نقص نہ ہو کہ حرکت وعمل میں رکاوٹ ہو۔

پنجم ایسی رائے کا مالک ہو جس کے ذریعہ رعایا کی تدبیر اور مصلحتوں کا تحفظ کر سکے۔

ششم ایسی بہادری کا مالک ہو کہ موقع پر جہاد کر سکے، اور ملک کی حفاظت کر سکے۔

ہفتم قریشی نسب کا ہو۔علماء نے اس شرط کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اگر اس نسب کا مناسب آدمی نہ ہو تو دوسرے نسب سے بھی امام کا انتخاب ہوسکتا ہے بشرطیکہ تدین وتقوی کی دوسری صفات اس میں موجود ہوں۔(الاحکام السلطانیۃ ص ۶)

اسلامی نظام حکومت میں محتسب کا منصب بھی اہم ہوتا ہے، رعایا کے معاملات پر اس کی براہ راست نظر ہوتی ہے، اس لئے معاشرہ کی بھلائی برائی اس سے چھپ نہیں سکتی۔امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

محتسب کا درجہ امام وقائد سے کم ہوتا ہے، لیکن اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ جمعہ جماعت کا اہتمام کرے، راست

کوئی اور امانتوں کی ادائیگی کا خیال رکھے، لوگوں کو عام بری باتوں سے اور جھوٹ، خیانت، ناپ تول کی کمی، دستکاری، صنعت، خرید وفروخت وغیرہ میں دھوکہ جیسے گناہوں سے سختی کے ساتھ روکے، اور قرآن وحدیث میں ان برائیوں پر جس طرح وعید ہے اسے بیان کرے۔(الحسبۃ لشیخ الاسلام ابن تیمیہ ص۱۴)

ادائے امانت میں احتیاط

آج کے دور میں صاحب اقتدار کا امانتدار ہونا باعث تعجب مانا جاتا ہے، لیکن اسلامی عہد حکمرانی میں اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، امام ابن تیمیہ نے اموی دور کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ وحاکم اگر ذمہ داری محسوس کرے تو اس کا حال کیسا ہوتا ہے، لکھتے ہیں (ترجمہ): کسی عباسی خلیفہ نے ایک عالم سے کہا کہ: اپنے مشاہدہ کا کوئی واقعہ سناؤ، انہوں نے کہا کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا کہ ان سے ایک شخص نے کہا: امیر المؤمنین! آپ نے اپنی اولاد کو حکومت کے مال سے کچھ نہ دیا، آج وہ فقیر ہیں، ان کے پاس کچھ بھی نہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز مرض الموت میں تھے، مگر اولاد کو بلایا، یہ دس سے زیادہ بیٹے تھے، اور کوئی بالغ نہ تھا، ان کو دیکھ کر عمر کی آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے، پھر اولاد سے کہا: میرے بیٹو! میں نے تمہیں تمہارے کسی حق سے محروم نہیں کیا ہے، میں لوگوں کی دولت لیکر تمہیں نہیں دے سکتا، سنو! اگر تم نیک ہوتو اللہ تعالی نیکوں کا حامی ہے، اور اگر نیک نہیں ہوتو میں تمہیں دولت نہیں دے سکتا کہ اس سے اللہ کی نافرمانی کرو، اب تم لوگ جاؤ، عالم کا بیان ہے کہ ان لڑکوں میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سو گھوڑے مع سامان دے دیئے۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ: عمر بن عبدالعزیز مسلمانوں کے خلیفہ تھے، ان کا دائرہ حکومت اقصائے مشرق (ترک ممالک) سے اقصائے مغرب (اندلس وغیرہ) تک، اور قبرص، حدود شام، طرطوس وغیرہ دارالحکومت سے اقصائے یمن تک پھیلا ہوا تھا، پھر بھی ان کی اولاد میں سے ہر ایک کو بیس درہم سے کم ہی ترکہ ملا تھا۔

ان کا بیان ہے کہ: میں نے بعض خلفاء کو دیکھا کہ ان کا ترکہ اولاد کے بیچ تقسیم ہوا تو ہر ایک کو چھ لاکھ دینار سے زائد ملا، پھر بھی میں نے ان میں سے بعض کو لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہوئے دیکھا۔(السیاسۃ الشرعیۃ ص ۷)

اس ایک واقعہ سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام نے حکام کے دلوں میں کس طرح احساس ذمہ داری اور اللہ تعالی کا خوف پیدا کردیا تھا، معاشرہ کے حالات میں سدھار وبہتری کا اصل سبب یہی تھا، اور ہم آج بھی اس تعلیم کو اپنا کر سکون وکامیابی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں۔



کتاب ''ھدایۃ النحو'' ایک جائزہ پر سرسری نظر

ابوارشد اعظمی

محدث بنارس، دسمبر ۲۰۰۷ء میں ایک مضمون بعنوان ''نصابی کتاب ''ہدایۃ النحو'' ایک جائزہ'' شائع ہوا ہے، اس میں لکھا ہے کہ کتاب مذکور میں بہت سی قابل مواخذہ چیزیں ہیں، اور بعض امور میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، ہم نے ان پر یا جائزہ پر سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے، جائزے میں پہلی غلطی کی نشان دہی اس طرح کی گئی ہے۔

ا-بعض تعریفات میں غلطیاں موجود ہیں، چنانچہ اعراب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں، "الاعراب ما به يختلف آخر المعرب، كالضمة والفتحة والكسرة، والواو والألف والياء".

اس تعریف میں غلطی دوطرح سے دکھائی گئی ہے، ایک یہ کہ "به" میں 'ب' کو اگر تعلیل کے لئے مانا جائے تو تعریف کا پہلا جزء تو صحیح ہوگا لیکن تمثیل کا جزء غلط ہوگا، اس لئے کہ فتحہ، ضمہ، کسرہ وغیرہ علامات اعراب ہیں، نہ کہ اعراب۔

ملاحظات: (ا) شروع میں اعراب کی تعریف کو غلط کہا گیا ہے، پھر ''باء'' کو تعلیلیہ مان کر صحیح بتایا گیا ہے، دونوں میں تضاد واضح ہے۔

(ب) تمثیل کو تعریف کا جزء سمجھنا یا کہنا غلط ہے، تعریف مذکور مکمل اور صحیح ہے، کیونکہ تمثیل الگ شئی ہے، جو کسی چیز کو سمجھانے کے لئے ذکر کی جاتی ہے۔

(ج) اگر فتحہ، ضمہ وغیرہ علامات اعراب ہیں، تو پھر اعراب کیا ہے؟ ہمارے ناقص علم کے مطابق یہ سب علامات رفع ونصب وجر ہیں، اور یہ تینوں اعراب کی قسمیں ہیں، اس لئے فتحہ وضمہ وکسرہ وغیرہ کو اعراب کہنا صحیح ہے۔

غلطی کا دوسرا پہلو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''اگر اسے (باء کو) استعانت کے لئے مانا جائے تو تعریف علامت اعراب کی ہوجائے گی، نہ کہ اعراب کی' اس پر بھی مذکورہ ملاحظات منطبق ہیں، تعجب ہے کہ ہدایۃ النحو میں اعراب کی مذکورہ تعریف کی تغلیط تو کردی گئی، مگر اس کی تصحیح وتصویب کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔

تعریف میں غلطی کی دوسری مثال یہ پیش کی گئی ہے کہ صاحب ہدایۃ النحو ''مبتدا وخبر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"المبتدأ والخبر هما اسمان مجردان عن العوامل اللفظية" الخ ذرا سا غور کرنے سے پتہ چل جائے گا کہ خبر کی تعریف اسم سے کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ خبر صرف اسم مفرد نہیں ہوتی ہے، بلکہ جملہ اسمیہ و جملہ فعلیہ بھی ہوتی ہے''۔

لگتا ہے کہ تعریف مذکور کے الفاظ پر توجہ دیئے بغیر لکھ دیا گیا ہے کہ ''خبر صرف اسم مفرد نہیں ہوتی ہے'' کیونکہ مؤلف نے خبر کی تعریف اگرچہ اسم سے کی ہے، لیکن حصر کے ساتھ اور مفرد کی قید کے ساتھ اس کو ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے ''صرف'' اور ''مفرد'' کے الفاظ کا اضافہ کرکے مؤلف کی بیان کردہ تعریف کو غیر صحیح کہنا صحیح نہیں ہے، اگر مبتدا و خبر کی پوری بحث کو توجہ سے پڑھا جائے، تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ خبر جملہ اسمیہ وفعلیہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ کتاب میں صریحاً مذکور ہے کہ "قد يكون الخبر جملة اسمية ..... أو فعلية"۔

۲-ہدایۃ النحو پر دوسرا نقد یہ کیا گیا ہے کہ بعض مقامات پر تعبیر کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، مثال میں مؤلف کے قول "والضم اعراب" کو نقل کرکے لکھا ہے کہ اس میں تعبیر کی غلطی ہے، اس لئے کہ ضمہ اعراب نہیں ہے، بلکہ علامت اعراب ہے الخ''۔

اس پر ہمارا کلام وہی ہے جو نمبر ۱ میں گذرا۔

تعبیری غلطی کی دوسری مثال میں مؤلف کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

وإن كان مضمرا وحد للواحد، نحو زيد ضرب، وثنى للمثنى نحو الزيدان ضربا، وجمع للجمع، نحو الزيدون ضربوا"۔

اس عبارت پر مواخذہ اس طرح کیا گیا ہے:

''ان کے قول "وحد للواحد وثنى للمثنى وجمع للجمع" میں تعبیر کی غلطی ہے، اس لئے کہ فعل واحد، مثنیٰ اور جمع نہیں ہوتا (کیونکہ فعل جنس ہے)''۔

جائزے میں اس پر جو طویل گفتگو کی گئی ہے وہ کئی لغزشوں پر مشتمل ہے، بنیادی طور پر عبارت مذکورہ کے فہم میں کوتاہی ہوئی ہے، یہ معروف حقیقت ہے کہ علم نحو وصرف میں جب فعل کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا مدلول مصدر کے مشتقات فعل ماضی ومضارع وغیرہ ہوا کرتے ہیں، اور جب ان کو واحد و تثنیہ وجمع سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ان سے مراد ان کے صیغے ہوتے ہیں، نہ کہ نفس فعل، چونکہ فعل بغیر فاعل کے تام نہیں ہوتا، اور فاعل کے مضمر ہونے کی صورت میں اس کے تثنیہ وجمع کی نشان وہی کے لئے علامت تثنیہ وجمع (الف اور واو) جنہیں فاعل کی ضمیریں کہا جاتا ہے، فعل ہی میں متصل ولاحق ہوتی ہیں، اس لئے افہام وتفہیم کے لئے فعل یا صیغۂ فعل کو تثنیہ وجمع سے تعبیر کرنا بالکل صحیح ہے، اگر غلط ہے تو صحیح تعبیر کیا ہوگی؟

مؤلف ہدایۃ النحو کی تعبیر میں غلطی ثابت کرنے کے لئے جتنی باتیں لکھی گئی ہیں، وہ سب نافہمی کا شاخسانہ ہیں، جس

سے سارے مسائل الجھ کر معمہ ہوگئے ہیں، رہی یہ بات کہ "فعل واحد، مثنی اور جمع نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ فعل جنس ہوتا ہے" نافہمی پر مبنی ہے، پہلے فعل کے جنس ہونے کا مفہوم سمجھنا چاہئے، اس کا مفہوم مدلول فعل مشتق کا مصدر ہے، اور مصدر اسم جنس ہوتا ہے، جس کا اطلاق قلیل وکثیر دونوں پر ہوتا ہے، لیکن لفظا تثنیہ اور جمع نہیں بنایا جاتا، اس لئے فعل کے جنس ہونے کا مدلول مصدر کے مشتقات فعل ماضی وغیرہ نہیں ہوسکتے، جن کے صیغے تثنیہ وجمع سے تعبیر کئے جاتے ہیں، فتدبر۔

اسی طرح یہ قول کہ "فعل واحد......نہیں ہوتا" آفتاب نصف النہار کے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ مصدر، مشتق (فعل) اور ہر اسم جنس مفرد ہوتا ہے، اہل فن میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا ہے، اور نہ یہ کہا ہے کہ "لا یوحد"، یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مزعومہ پر استدلال کے لئے ڈاکٹر غریب عبدالمجید کی کتاب کے حوالے سے جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی ان کے خلاف حجت ہے، کیونکہ اس میں صراحت ہے کہ فعل (مصدر) کو مثنی اور جمع نہیں بنایا جاتا" دیکھئے اس میں صرف تثنیہ وجمع بنائے جانے کی نفی کی گئی ہے، واحد یا مفرد ہونے کی نفی نہیں فرمائی ہے۔

ڈاکٹر غریب کے قول میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے کہ "فعل بغیر تحدید قلیل وکثیر دونوں پر دلالت کرتا ہے" اس قول کی آخری سطر کو غور سے پڑھا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ فعل بطور تحدید، واحد وتثنیہ پر بھی دلالت کرتا ہے۔

تعبیر پر زبردستی کی گرفت یا اس کی تغلیط کی کوشش یہ بھی ہے:

"عشرون اور اس کے اخوات کو مصنف نے جمع مانا ہے، اس لئے کہ اصول عدد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"وأصول العدد اثنتا عشرة كلمة، واحدة الى عشرة، ومائة وألف".

ان کا یہ قول اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب دہائیوں کے الفاظ کو جمع مانا جائے۔"

یہ تنقیدی عبارت انتہائی مبہم ہے، غالبا اس سے مقصود یہ ہے کہ مؤلف نے عشرات (عشرون الى تسعون) کو جمع مان کر اصول عدد میں شمار نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ سب مفرد ہیں، ان کو بھی اصول عدد میں ذکر کرنا چاہئے تھا، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس لئے ان کا قول مذکور غلط ہے۔

اگر مقصود یہی ہے تو مبہم تنقیدی کلام تعبیری غلطی کا شاہکار ہے، رہا عشرات کے جمع کا مسئلہ تو مؤلف خود اقسام اعراب کی بحث میں ان کے جمع نہ ہونے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، اس لئے مؤلف کے قول مذکور پر الزام عائد نہیں ہوتا کہ انہوں نے عشرات کو جمع مان کر اصول عدد سے خارج کر دیا ہے، البتہ نافہمی اور عدم تدبر کی بناپر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ جب مؤلف کے نزدیک بھی یہ جمع نہیں ہیں تو انہوں نے اصول عدد کے تحت ان کو ذکر کیوں نہیں کیا؟

دو دو چار کی طرح جواب واضح ہے کہ عشرات اصالۃً مفرد نہیں ہیں، کیونکہ عشرون عشرۃ سے، ثلاثون، ثلاثۃ سے، اور

اَربعون، اَربعۃ سے الخ متولد ومتفرع ہیں، اس لئے یہ فروع ہوئیں، نہ کہ اصول، ثابت ہوا کہ مؤلف کا قول صدفی صد صحیح ہے۔

فاضل جائزہ نگار آگے لکھتے ہیں:

’’۳۔ بعض مقامات پر مؤلف کی یہ غلطی نظر آئی کہ وہ اصطلاحی لفظ کو لغوی معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور چند ہی سطروں کے بعد اصطلاحی معنی میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں: الأسماء المجرورة هي المضاف إليه فقط، وهو كل اسم نسب إليه شيء بواسطة حرف الجر لفظا، نحو مررت بزيد، ويعبر عن هذا التركيب في الاصطلاح بأنه جار ومجرور، أو تقديرا، نحو غلام زيد، تقديره: غلام لزيد، ويعبر عنه في الاصطلاح بأنه مضاف ومضاف اليه"۔

غلطی یہاں پر یہ ہے کہ اصطلاحی لفظ المضاف الیہ کو پہلے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے، جب کہ متبادر الی الذہن اصطلاحی معنی ہوتا ہے، پھر اخیر میں اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے‘‘۔

یہ ناقدانہ کلام انتہائی نافہمی کی کہانی سنا رہا ہے، کیا کوئی ادنی طالب علم بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مؤلف نے مضاف الیہ کی جو تعریف بیان کی ہے، وہ مضاف الیہ کا لغوی معنی ہے؟ اور اس کا اصطلاحی معنی ’’جار ومجرور‘‘ اور ’’مضاف ومضاف الیہ‘‘ ہے؟

مؤلف کا قول صاف بول رہا ہے کہ شروع میں مضاف الیہ کی تعریف بیان کی گئی ہے، اس کے بعد مضاف الیہ کی دو مثالیں ذکر کر کے ان کی ترکیب کی اصطلاحی تعبیر ذکر کی ہے، نہ کہ مضاف الیہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی، کیونکہ اس کا مؤلف کے قول سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے، اگر بالفرض آخری کلام کو مضاف الیہ کا اصطلاحی معنی کہا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ اصطلاح میں مضاف الیہ کا معنی ’’جار ومجرور‘‘ اور ’’مضاف ومضاف الیہ‘‘ کی ترکیب ہے، یعنی ایک چیز (مضاف الیہ) جار بھی ہے مجرور بھی، اور مضاف بھی ہے اور مضاف الیہ بھی، الا یہ کہ تتابع اضافات کی ترکیب ہو۔

خلاصہ یہ کہ ہدایۃ النحو کی مذکورہ عبارت کے شروع میں مضاف الیہ کی تعریف بیان کی گئی ہے، پھر اس کی مثالوں کی نحوی ترکیب بتائی گئی ہے، تعریف اور ترکیب دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور دونوں کا مدلول ومصداق بھی جداگانہ ہے۔

جائزے میں (۴) کے تحت ایک بڑی مضحکہ خیز بات لکھی گئی ہے کہ ’’ہدایۃ النحو‘‘ میں طباعت کی بہت ساری غلطیاں ہیں‘‘۔

ان غلطیوں سے نفس کتاب اور مؤلف کا کیا تعلق ہے؟ ان کے مرتکب طابع وناشر اور خرید نے و پڑھنے پڑھانے والے ہیں، جائزے میں مثالاً جو غلطی نقل کی گئی ہے، وہ ہمارے پاس موجودہ نسخے مطبع مجیدی کان پور میں نہیں ہے، طباعتی غلطیوں کا الزام مصنف اور اس کی تصنیف پر عائد نہیں ہوتا۔

(ب) کے تحت لکھا ہے کہ:

''بعض امور میں نقص اور خامی پائی جاتی ہے، جو درج ذیل ہے:

۱-ضمیر مرفوع متصل کے ذکر میں نقص ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: "وهو على قسمين: متصل، وهو ما لا يستعمل وحده، إما مرفوع نحو ضربت الى ضربن".

یہاں پر یہ نقص دکھایا گیا ہے کہ مؤلف نے صرف انہیں ضمیروں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جو فعل ماضی سے متصل ہوئی ہیں، اور فعل مضارع وامر میں یا مخاطبہ کو جیسے تفعلین، وافعلی، کو ترک کر دیا ہے، یہ کوئی نقص وخامی نہیں ہے، کیونکہ مؤلف نے فعل ماضی سے متصل ضمیروں کو صرف مثالاً ذکر کیا ہے، اور مثال میں تمام چیزوں کا حصر واحاطہ نہیں کیا جاتا ہے، جیسا کہ عام دستور ہے۔

۲-(دوسرا نقص) ''کہیں کہیں تعبیر میں نقص ہے، چنانچہ نعت حقیقی اور منعوت کے مابین مطابقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "القسم الأول يتبع منعوته في عشرة أشياء، في الإعراب والتعريف والتنكير والإفراد الخ"

اس کی تعبیر میں نقص ہے، کیونکہ صحیح تعبیر في أربعة من عشرة ہے''۔

یہ بھی قابل مواخذہ نقص نہیں ہے، کیونکہ ہر خواندہ وناخواندہ جانتا ہے کہ جو چیز مذکر ہوگی وہ مؤنث نہیں ہوگی، یہی حال باقی امور میں مطابقت کا ہے، عیاں راچہ بیاں، البتہ "في أربعة من عشرة" کی تعبیر کو اصح اور بہتر کہا جاسکتا ہے، اگر مصنف کی تعبیر میں یہ نقص ہے، تو اس پر استدلال کی یہ تعبیر ''اس لئے کہ منعوت اگر مرفوع ہے تو نعت مرفوع ہونے میں اس کے تابع ہوگی، نہ کہ نصب وجر میں'' الخ بدرجہ اولیٰ نقص سے خالی نہیں ہے، کیونکہ اس سے وہم ہوتا ہے کہ نعت منعوت کے منصوب ومجرور ہونے میں اس کے تابع نہیں ہوگی تقریباً یہی حال ''۳'' کے تحت مذکورہ نقص کا بھی ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہر مصنف کا اپنا اسلوب نگارش ہوتا ہے، کوئی کسی بات کو دو لفظوں میں ذکر کر دیتا ہے، کوئی اس کو سطروں میں بیان کرتا ہے، اجمال وتفصیل اور ایجاز واطناب تحریروں وتقریروں کی روایت ہے، ان سے استفادہ پڑھنے والے کے فہم کے بقدر ہوتا ہے، ویسے کسی کتاب کے بارے میں نقص سے پاک ہونے کا دعوی نہیں کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کی تمام باتوں سے ہر شخص متفق ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ موجودہ دور میں تسہیل وتجدید کے کارنامے بہت تیز رفتاری سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں، اس لئے بدلتے حالات میں اسلوب تصنیف کی تبدیلی ناگزیر ہے، اور تحقیق، تجدید وتسہیل کی کوئی خدمت انجام دینا قابل ستائش عمل ہے، امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مرتبہ ''تیسیر النحو'' کو قبولیت وافادیت کا شرف حاصل ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

☆☆☆

ماہ محرم
اہمیت اور مسائل

مولانا اسعد اعظمی/استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو زندگی گزارنے کے لئے شریعت نازل کرکے ہر طرح اس کی رہنمائی فرمائی۔ اس دنیا میں انسان کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے اس کو قرآن اور حدیث کے ذریعہ واضح طور پر بیان کردیا۔ اسلامی سال کے پہلے مہینے محرم الحرام کے تعلق سے شرعی تعلیمات کیا کہتی ہیں۔ اس مہینہ میں کیا کرنا چاہئے اور کن چیزوں سے بچنا چاہئے سطور ذیل میں مختصراً انہیں بیان کیا جارہا ہے:

۱-حرمت والا مہینہ:

قرآن کریم کی سورہ توبہ کی آیت نمبر (۳۶) میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی کے یہاں مہینوں کی تعداد (۱۲) ہے، اور ان میں سے چار مہینے حرمت وادب والے ہیں، بخاری ومسلم میں مروی نبی اکرم ﷺ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار مہینے یہ ہیں: (۱) ذوالقعدہ (۲) ذوالحجہ (۳) محرم (۴) رجب۔ ان مہینوں میں قتل وقتال اور لوٹ مار وغیرہ خاص طور سے ممنوع ہیں اور ان مہینوں کے ادب واحترام کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔

۲-حضرت موسی علیہ السلام اور ان کی قوم کی نجات کا مہینہ:

حضرت موسی علیہ السلام کو اللہ تعالی نے نبی بنا کر فرعون کے پاس بھیجا تھا، موسی علیہ السلام کی قوم بنو اسرائیل اس وقت مصر میں فرعون کا ظلم وستم برداشت کررہی تھی، موسی علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بنواسرائیل کو فرعون کے چنگل سے نجات دلائیں، موسی علیہ السلام فرعون کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے اور اس سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرتے رہے مگر وہ کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہ تھا، ایک رات موسی علیہ السلام اللہ کے حکم سے بنواسرائیل کو لے کر مصر سے چل پڑے، جب صبح ہوئی اور فرعون کو پتہ چلا کہ بنواسرائیل راتوں رات یہاں سے نکل گئے تو اس نے اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا اور بالآخر سمندر میں غرق ہوگیا، اس طرح بنواسرائیل کو ہمیشہ ہمیش کے لئے فرعون اور اس کے ظلم وتشدد سے نجات مل گئی، قرآن میں جگہ جگہ اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: سورہ یونس آیت نمبر: ۹۰ تا ۹۲، سورہ شعراء

آیت نمبر ۶۰ تا ۶۷، یہ انتہائی عبرتناک واقعہ ہے، اس کی تفصیل مذکورہ آیتوں اور ان کی تفسیروں میں پڑھ کر عبرت حاصل کرنا چاہئے اور اپنا ایمان مضبوط کرنا چاہئے۔

واضح ہو کہ بنو اسرائیل کی نجات کا یہ واقعہ محرم کے مہینے کی دسویں تاریخ کو پیش آیا تھا جس کو عاشوراء کا دن کہا جاتا ہے، صحیح حدیثوں میں اس کی دلیل موجود ہے، یہاں صرف ایک حدیث بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں، آپ نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ مبارک دن ہے، اسی دن اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات دلائی تھی جس کے شکرانے میں حضرت موسی علیہ السلام نے روزہ رکھا، آپ نے فرمایا: میں حضرت موسی کا تم سے زیادہ حقدار ہوں، چنانچہ آپ نے اس دن روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔ (بخاری ومسلم)

۳-عاشوراء کا روزہ:

حدیث مذکور سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ مسلمانوں (امت محمدیہ) کو اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، عاشوراء کا یہ روزہ سنت ہے اور اس کا ثواب صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے گذشتہ ایک سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان کے بعد محرم کا روزہ رکھنا سب سے افضل ہے۔ (مسلم)

صحیح مسلم وغیرہ کی ایک دوسری حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کی مخالفت کرتے ہوئے دسویں محرم کے ساتھ نویں محرم کا روزہ بھی ملالینا چاہئے، مسند احمد وغیرہ کی حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ یہود کی مخالفت کرو اور عاشوراء سے پہلے یا اس کے بعد بھی ایک روزہ رکھ لو۔

احادیث صحیحہ صریحہ سے ثابت ان روزوں کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، اور اجر عظیم حاصل کرنا چاہئے، افسوس کہ ضعیف اور موضوع روایتوں پر بڑی پابندی سے بعض لوگ عمل کرتے ہیں اور بخاری ومسلم جیسی حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں وارد حدیثوں میں بیان کی گئی فضیلتوں کے حصول سے ان کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

۴-بدعات ومحرمات سے اجتناب:

محرم کی دسویں تاریخ ہی کو نواسۂ رسول حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا تھا، جو بلاشبہ ایک الم انگیز واقعہ

ہے، شیعہ حضرات اس واقعہ کو بنیاد بنا کر محرم کے تقریبا پورے مہینہ کو غم والم کا مہینہ قرار دیتے ہیں، محرم کا مہینہ شروع ہوتے ہی مجلسیں منعقد کر کے اس واقعہ کی تفصیلات سناتے ہیں، جن میں صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کو لعن وطعن کرتے ہیں، اسی طرح حضرت حسین کا تعزیہ بناتے ہیں، اس سے منتیں مانگتے ہیں، شروع مہینہ ہی سے ماتم شروع کر دیتے ہیں، سیاہ کپڑے پہنتے ہیں، نوحہ کرتے وگریبان چاک کرتے ہیں، محرم کو سوگ کا مہینہ قرار دے کر اس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، وغیرہ وغیرہ۔

واضح رہے کہ یہ تمام اعمال ورسومات خالص شیعی ہیں، اہل سنت کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اہل حدیث، دیوبندی وبریلوی تینوں فرقے ان اعمال کے بدعت ہونے اور حرام ہونے پر متفق ہیں، کیونکہ یہ تمام اعمال اسلامی تعلیمات کی رو سے حرام وممنوع ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں جو (کسی کی موت پر) منہ پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی پکار پکارے۔

صحابہ کرام کے لئے قرآن میں جگہ جگہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہا گیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میرے صحابہ کو گالی نہ دو، اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو بھی کسی صحابی کے ایک مد یا آدھا مد صدقہ کرنے کے برابر ثواب کا حقدار نہ ہوگا۔ (بخاری ومسلم)

مولانا رشید احمد گنگوہی ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

''ذکر شہادت کا ایام عشرہ محرم میں کرنا بمشابہت روافض کے منع ہے اور ماتم نوحہ کرنا حرام ہے''۔ (فتاوی رشیدیہ ص:۱۳۹)

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

''تعزیہ بنانا (بھی حرام ہے) جس کی وجہ سے طرح طرح کا فسق وشرک صادر ہے''۔ (اصلاح الرسوم ص ۱۳۶)

مولانا احمد رضا خاں بریلوی فرماتے ہیں:

''تعزیہ رائجہ مجمع بدعات شنیعہ سیئہ ہے، اس کا بنانا، دیکھنا جائز نہیں، اور تعظیم وعقیدت سخت حرام واشد بدعت۔ اللہ سبحانہ وتعالی مسلمان بھائیوں کو راہ حق کی ہدایت فرمائے، آمین۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔ (فتاوی رضویہ ۱۸۶/۹)

مولانا احمد رضا خاں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''تعزیہ ممنوع ہے، شرع میں کچھ اصل نہیں، اور جو کچھ بدعات ان کے ساتھ کی جاتی ہیں سخت ناجائز ہیں''۔ (فتاوی رضویہ ۱۸۹/۹)

مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"تعزیہ بنانا اور ساتھ نشان تعظیم وتوقیر کے چبوترہ یا کسی مقام بلند پر قائم کرنا اور رکھنا اور نذر ونیاز بتوقع حصول مطالب دنیاوی وامید حاجت روائی اور فراخی روزی وطلب اولاد وجاہ ومنصب کے اس پر چڑھانا اور اس کی بے ادبی میں نقصان جان ومال کا اعتقاد رکھنا بجہت عقیدہ واجب التعظیم کے سلام اور مجرا اور سجدہ اس کو کرنا جیسا کہ رسم ورواج وعرف وعادت تعزیہ پرستوں کا ہے صریح بت پرستی ہے............" ۔(فتاوی نذیریہ:۱/۱۷۵)

تنبیہ:

شیعہ حضرات نے محبت حسین کے دعوی کے ساتھ یوم عاشوراء اور ماہ محرم کو غم والم اور سوگ کا مہینہ قرار دیا تو دوسری طرف دشمنان علی وحسین (خارجیوں اور ناصبیوں) نے شہادت حسین کے دن (عاشوراء) کو خوشی ومسرت کا دن قرار دیا اور اس کی فضیلت میں جھوٹی حدیثیں گڑھ لیں، اس دن وہ اچھے پکوان پکاتے اور مختلف انداز سے خوشیاں مناتے ہیں، اہل اسلام کو ان دونوں قسم کی بدعتوں سے پرہیز کرنا چاہئے، ائمہ اربعہ اور دیگر علماء نے ان کو پسند نہیں کیا اور نہ ان اعمال کی کوئی شرعی دلیل ہے۔

اللہ رب العزت تمام مسلمانوں کو سنت کا پابند بنادے اور انہیں ہر قسم کی بدعات وخرافات سے محفوظ رکھے، آمین۔

☆☆☆

آؤ عہد کریں ہم سب ایک ہیں

محمد ثناءاللہ عمری (ایم۔اے۔عثمانیہ)

ہندوستان، ہمارا مادر وطن، صدیوں سے مختلف نسلوں، زبانوں، تہذیبوں اور مذہبوں کا گہوارہ رہا ہے، یہ نا قابل انکار حقیقت اس ملک کی لمبی اور پرانی تاریخ سے ظاہر ہے اس کے حق میں مقدر کا فیصلہ یہی تھا، دوسرے لفظوں میں ہمارے اس قدیم اور عظیم ملک کے اندر کثرت میں وحدت کا سماں رہا ہے، ابھی تاریخ کا سورج چڑھا ہی تھا کہ یہاں آریہ آئے، اور بیچ کی صدیوں میں مسلمانوں نے آ لنگر ڈالے، ملک کے اصلی باشندوں دراوڑیوں کے ساتھ مل جل کر یہاں کی سوسائٹی کا اٹوٹ حصہ بن گئے اور زندگی کی راہوں میں ایک دوسرے پر اثر ڈالنے اور اس سے اثر لینے لگے، اس طرح یہاں کی تہذیب وتمدن گنگا جمنی ہوگئی۔

کثرت میں وحدت کی یہ شان ایک پُر بہار باغ کا نظارہ پیش کرتی ہے جو رنگارنگ پھولوں کی مہک کے ساتھ چمک دمک بھی رکھتا ہے اور جمالیاتی ذوق کو نظارے کی دعوت دیتا ہے، ذوق دہلوی مرحوم کیا خوب کہہ گئے ہیں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہاں ہمیں زندگی کی ایک ناگزیر حالت یاد رکھنی چاہئے اور وہ ہے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ، خاندانوں اور برادریوں کے اندر زندگی کے بے شمار مسائل میں نقطۂ نظر کا، پسند ناپسند کا اختلاف، فطرت نے ہر فرد کے اندر الگ الگ رجحانات ومیلانات رکھے ہیں جو اس کی انفرادیت کا پتہ دیتے ہیں، پھیلایئے تو بات بہت دور تک جاسکتی ہے، کہنا یہ ہے کہ زندگی کی بے شمار باتیں ایسی ہیں جن میں ایک خاندان کے افراد کے درمیان بھی پوری یکسانیت قائم نہیں کی جاسکتی، اس لئے بھی کہ یہ یکسانیت ایک غیر فطری اور بے کیف بات ہے اسے لینے سے ہمارا ذوق انکار کرتا ہے۔

معاملے کے ایک دوسرے پہلو پر بھی غور کیجئے، ہمیں کچھ چیزیں ورثہ میں ملی ہیں، مثلاً ہماری زبان، ہماری تہذیب اور ہماری رنگت، ہم ان میں سے کسی چیز کو چھوڑ نہیں سکتے، مادری زبان کی محبت ہماری گھٹی میں پڑی ہے ہماری تہذیب ہمیں عزیز ہے، ہمارا رنگ ہمارے جسموں میں پیوست ہے، کوئی دیوانہ ہی ہوگا جو ان باتوں کو ترک کردینے کی بات کرے گا۔

زندگی کی ایک ضرورت مذہب بھی ہے، اور کسی بھی ملک کی طرح ہمارے ملک میں بھی کئی مذہب موجود ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ہم مختلف نسلوں، تہذیبوں اور زبانوں والے ایک ملک کے شہری بن کر رہ سکتے ہیں تو مختلف مذہبوں کے پیرو ہوکر ایک ہی ملک کے اندر امن چین کے ساتھ کیوں رہ بس نہیں سکتے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے ہمیں اس پر خوب غور کرنا چاہئے۔

مذاہب کے اختلاف کو مخالفت وعداوت کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا اگر ایسا کیا گیا تو ہر مذہب کے ماننے والوں کی آپسی کھینچا تانی دنیا کو کہیں کا نہیں رکھے گی، اور آئندہ نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔

مذاہب کے اس گورکھ دھندے کو جانے دیجئے، آیئے، ایک عملی سوال پر غور کریں، ہمارے اپنے ہی ملک کو لیجئے، مختلف مذاہب کے پیرو یہاں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں، دوست ہیں، رنج وراحت کے شریک ہیں، ان میں کوئی محسن ہے، کوئی احسان مند، کوئی مالک ہے کوئی ملازم، کوئی افسر ہے کوئی ماتحت، کوئی تاجر ہے کوئی گاہک، کوئی وکیل ہے کوئی ان کا موکل، کوئی ڈاکٹر ہے کوئی اس کا مریض، کوئی استاد ہے کوئی اس کا شاگرد، کوئی لیڈر ہے اور کوئی اس کا پیرو، مختلف مذاہب کے پیروؤں کے یہ سارے باہمی تعلقات زندگی کی گاڑی کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں، ایسے میں کیا یہ عقلمندی اور انسانیت کی بات ہوگی کہ ہم مذہبی منافرت کو ہوا دیں اور لڑنے بھڑنے، مرنے مارنے لگیں؟ اقبال فرما گئے ہیں ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس سلسلہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان پر اپنی ڈیڑھ دوسوسالہ حکومت کے دوران اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے انگریز نے کوئی کور کسر اٹھا نہیں رکھی، ملک کی متحدہ قومیت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اپنائی، دوقومی نظریہ کو شہ دی اور اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ کو بگاڑ کر پیش کیا، مثال کے طور پر اورنگ زیب کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا کہ وہ ہندو دشمن تھا، مگر راجندر پرساد جی نے لکھا ہے کہ یہ بات غلط ہے، اس نے ایک طرف ہندوؤں کو اپنی فوج میں اونچے عہدے دیئے تھے تو دوسری طرف مندروں کو جاگیریں بھی دی تھیں۔

پھر چھتراپتی شیواجی کو مسلم دشمن کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ ان کی فوج میں مسلمان سپاہی بہت تھے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کا کوئی صفحہ کہیں پڑا ہوا نظر پڑجاتا تو وہ بڑے احترام سے اسے اٹھا لیتے اور کسی مسلمان کے حوالے کر دیتے، اسی طرح لاہور کے حاکم راجہ رنجیت سنگھ کے بعض وزیر ومشیر مسلمان تھے۔ ایسی بے تعصبی کی مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں۔

خیر یہ تو ذرا پرانی باتیں ہیں، حالیہ تاریخ یہ ہے کہ ملک کی جنگ آزادی میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھوں نے کندھے سے کندھا ملا کر بھرپور حصہ لیا، بڑی قربانیاں پیش کیں، ملک آزاد ہوا، اسے سیاسی آزادی تو ملی، مگر غریبی، بیماری، ناخواندگی اور چھوت چھات کی مصیبتوں سے آزادی حاصل کرنی باقی ہے اور جب تک یہ سماجی اور معاشی آزادی نہیں مل جاتی اس وقت تک سیاسی آزادی بے معنی ہی رہ جائے گی۔

اور یہ وہ مسائل ہیں جو ملک کے سبھی طبقوں کو درپیش ہیں اور اسی وقت حل ہو سکے ہیں جب کہ ہم سب مل کر ان چیلنجوں کا مقابلہ کریں، ملک کی تعمیر وترقی کا کام اتحاد واتفاق ہی کے بل بوتے پر ہوسکتا ہے، ہم لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے رہیں گے تو ملک کا وقت، اس کی قوت اور اس کی دولت سب اکارت ہوجائیں گے، لہذا آیئے! آزادی کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ہم سب آپسی جھگڑے مٹا دینے اور مل جل کر وطن کی خدمت کرنے کا عہد کریں ؎

بارے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو، وجیاواڑہ)

☆☆☆

نماز میں پڑھی جانے والی سورتیں

مسعود عالم عبدالقیوم سلفی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وأقيموا الصلاة وآتوا الزكاة واركعوا مع الراكعين﴾۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ قیام صلاۃ سے مراد یہ ہے کہ فرائض نماز بجالانا، وقت کی نگہبانی کرنا، مکمل طہارت کرنا، رکوع وسجود پورے کرنا، تلاوت اچھی طرح کرنا، تحیات ودرود پڑھنا، اور نماز کو قولی وفعلی دونوں حالت میں نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق ادا کرنا۔(۱)

نماز کا درجہ اتنا اعلی وارفع ہے اور اس کو مخصوص ہیئت سے ادا کرنا اس قدر ضروری ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس پر عمل کر کے دکھایا اور اس کی کیفیت، ہیئت، اوقات سکھائے، ابو داود اور ترمذی کی روایتوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "أمني جبرئيل عند البيت" (۲) یعنی خانہ کعبہ کے پاس جبرئیل علیہ السلام نے میری امامت کی، پھر نبی کریم ﷺ سکھائے ہوئے ضابطوں کے مطابق نماز پڑھتے رہے اور ساتھ ہی امت کو یہ حکم دیا: "صلوا كما رأيتموني أصلي" (۳) یعنی تم بعینہ اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہماری نماز کی شکل وصورت اور قولی فعلی حالت نبی کریم ﷺ کی نماز کے مطابق ہونی چاہئے، اگر اس میں ہم سے کوتاہی سرزد ہوجائے تو یقیناً ہماری نماز ناقص رہ جائے گی، حدیث مسیٔ الصلاۃ میں آپ ﷺ نے فرمایا: "ارجع فصل فانك لم تصل" (۴) جاؤ اور دوبارہ نماز ادا کرو کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی ہے، آپ ﷺ نے اس صحابی کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم اس لئے دیا تھا کہ اس نے نماز کے تمام ارکان کو قاعدے سے ادا نہیں کیا تھا، یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نماز کے ساتھ ہماری نماز جتنی زیادہ مطابقت اور مماثلت رکھے گی اللہ کے پاس قبولیت میں اتنا ہی زیادہ رتبہ پائے گی اور اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔

نماز میں قرأت سب سے اہم رکن ہے، جہاں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی ہے،

(۱) تفسیر ابن کثیر۔ (۲) ابو داود: ۳۹۳، ترمذی: ۱۴۹۔
(۳) صحیح البخاری: ۶۳۱۔ (۴) صحیح البخاری: ۷۵۷۔

"لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب" (۱)یعنی سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی ہے، وہیں اس کے علاوہ بھی قرآن کریم کی تلاوت مشروع ہے، ویسے تو سورہ فاتحہ کے علاوہ کسی بھی سورت کو پڑھا جا سکتا ہے، حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں: "أمرنا أن نقرأ بفاتحة الكتاب وما تيسر" (۲)ہم کو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ سورہ فاتحہ پڑھیں اور اس کے علاوہ جو میسر ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں ہم جہاں سے چاہیں قرآن پڑھ سکتے ہیں لیکن ذخیرہ احادیث میں نبی کریم ﷺ کی قرأت کا ذکر ملتا ہے کہ آپ کون کون سی سورت کس کس نماز میں پڑھتے تھے، ہمیں چاہئے کہ ہم بھی محبت رسول اور اتباع سنت کے جذبہ صادقہ کے تحت مسنون قرأت کو ترجیح دیں، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: "والحق أن ما صح عن النبي ﷺ في ذلك وثبتت مواظبته عليه فهو مستحب وما لم تثبت مواظبته عليه فلا كراهته فيه" (۳)یعنی نبی کریم ﷺ سے اس سلسلے میں جو کچھ صحیح طور پر منقول ہے اور جس پر آپ کی مواظبت ثابت ہے وہ مستحب ہے اور جس پر مواظبت ثابت نہیں ہے اس کے پڑھنے میں کوئی کراہت بھی نہیں ہے۔

امام ابن قدامہ "المغنی" میں لکھتے ہیں: "ان قراءة السورة بعد الفاتحة مسنونة في الركعتين من كل صلاة لا نعلم في هذا خلافا، ويستحب أن يكون على الصفة التي رويت، اقتداء برسول الله ﷺ واتباعا بسنته". (المغنی ۲/۲۷۴)یعنی سورہ فاتحہ کے بعد ہر نماز کی پہلی دو رکعتوں میں دوسری سورت کی قرأت مسنون ہے اس سلسلے میں ہمیں کوئی اختلاف معلوم نہیں ہے، مستحب ہے کہ سورتوں کی تلاوت اس صفت کے مطابق ہو جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے تاکہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء اور آپ کی سنت کا اتباع ہو جائے، مزید وہ لکھتے ہیں: "ومهما قرأ به بعد أم الكتاب أجزأه وقد روى عن النبي ﷺ وأصحابه أنهم قرأوا بأقل من ذلك وأكثر" (المغنی ۲/۲۷۵) یعنی ام الکتاب پڑھنے کے بعد جو سورہ بھی پڑھے کافی ہو جائے گا، نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب سے اس سے کم وزیادہ پڑھنا ثابت ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "وانما تنازع العلماء في استحباب ذلك وكراهيته، فعند مالك يكره أن يقرأ بالسجدة بالجهر، والصحيح أنه لا يكره، كقول أبي حنيفة والشافعي وأحمد، لأنه قد ثبت في الصحيح عن النبي ﷺ أنه سجد في العشاء بـ "إذا السماء انشقت"، وثبت في الصحيحين أنه كان يقرأ في الفجر يوم الجمعة "ألم تنزيل، وهل أتى"، وعند مالك يكره أن يقصد سورة

(۱) صحیح البخاری: ح ۷۵۶۔ (۲) سنن ابی داود ۱/۵۱۲ ح: ۸۱۸۔
(۳) فتح الباری شرح صحیح البخاری ۲/۳۱۶۔

بعينها، وأما الشافعي وأحمد فيستحبون ما جاء ت به السنة مثل الجمعة والمنافقين في الجمعة والذاريات واقتربت في العيد، وألم تنزيل وهل أتى في فجر الجمعة ...... وأنه لا ينبغي المداومة عليها، بحيث يتوهم الجهال أنها واجبة، وأن تاركها مسيىء، بل ينبغي تركها أحيانا لعدم وجوبها والله أعلم" (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۲۴/۲۰۵)

یعنی اس کے مستحب ہونے اور مکروہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے تو امام مالک کے نزدیک جہری نماز میں سجدہ والی سورتوں کو پڑھنا مکروہ ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے، یہی قول امام ابوحنیفہ، شافعی اور احمد کا ہے، اس لئے کہ صحیح روایت میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے عشاء کی نماز میں "اذا السماء انشقت" میں سجدہ کیا ہے، اور صحیحین میں ہے کہ آپ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں "ألم تنزيل" اور "هل أتى على الانسان" پڑھتے تھے، اور امام مالک کے نزدیک کسی معین سورہ کا قصد کرنا مکروہ ہے اور امام شافعی واحمد کے نزدیک ان سورتوں کو پڑھنا مستحب ہے جن کا ذکر حدیثوں میں آیا ہے، جیسے جمعہ میں سورہ جمعہ اور منافقین پڑھنا اور عید کی نماز میں سورہ ذاریات اور اقتربت پڑھنا اور جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورہ ألم تنزيل اور هل أتى پڑھنا..........لیکن ان سورتوں کو پڑھنے میں اس طرح مداومت نہیں برتنی چاہئے کہ جہلاء اس کو واجب سمجھ لے بلکہ مناسب یہ ہے کہ عدم وجوب کی وجہ سے کبھی کبھی ترک بھی کردینا چاہئے۔

ان اقوال کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مخصوص نمازوں میں مخصوص سورتوں کو پڑھنا مستحب ہے۔

ظہر وعصر میں قرأت

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ ہم عصر وظہر کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کے قیام کا اندازہ کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ آپ ظہر کی پہلی دورکعتوں میں اتنی دیر قیام کرتے تھے جتنی دیر میں الم تنزیل السجدۃ پڑھی جائے اور پچھلی دورکعتوں میں اس کا آدھا اور عصر کی پہلی دورکعتوں میں ظہر کی پچھلی دورکعتوں کے برابر اور عصر کی پچھلی دورکعتوں میں اس کا آدھا۔(صحیح مسلم)

جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز میں "والليل اذا يغشى" پڑھتے اور عصر میں بھی اتنی بڑی سورتیں پڑھتے تھے اور فجر کی نماز میں اس سے لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔(۱)

جابر بن سمرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز میں "سبح اسم ربك الأعلى" پڑھتے تھے اور فجر کی نماز میں اس سے لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔(۲)

جابر بن سمرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر وعصر کی نماز میں "والسماء والطارق" اور "والسماء ذات

(۱) صحیح مسلم مع النووی ۴/۱۷۴۔ (۲) صحیح مسلم مع النووی ۴/۱۷۴۔

البروج" یا انہیں جیسی سورتیں پڑھتے تھے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز میں سجدہ کیا پھر کھڑے ہوئے اور پھر رکوع کیا تو ہم نے یہ سمجھا کہ آپ نے "تنزیل السجدۃ" پڑھا۔(۲)

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھتے تھے تو کوئی ایک آدھ آیت کئی آیتوں کے بعد سنائی دیتی، سورہ لقمان اور الذاریات کی۔(۳)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، آپ نے یہ دو سورتیں پڑھیں دو رکعتوں میں "سبح اسم ربك الأعلى" اور "هل أتاك حديث الغاشية" (۴)

امام نووی لکھتے ہیں: "قال العلماء: كانت صلاة رسول الله ﷺ تختلف في الاطالة والتخفيف باختلاف الأحوال، فإذا كان المأمون يؤثرون التطويل ولا شغل هناك له ولا لهم طول واذا لم يكن كذلك خفف، وقد يريد الاطالة ثم يعرض ما يقضي التخفيف كبكاء الصبي ونحوه، وينضم الى هذا قد يدخل في الصلاة أثناء الوقت فيخفف". (شرح صحیح مسلم للنووی ۴۰۹/۲)

یعنی محققین کہتے ہیں کہ اختلاف احوال کی وجہ سے آپ نماز میں تطویل وتخفیف کرتے تھے، اگر آپ کو ایسا محسوس ہوتا کہ آپ کی اور مقتدیوں کی کوئی مشغولیت نہیں ہے تو لمبی کرتے تھے اور جب اس کے خلاف صورت حال ہوتی تو مختصر کرتے تھے، اور کبھی آپ لمبی پڑھنے کا ارادہ کرتے لیکن کوئی چیز درپیش ہو جاتی جس کی وجہ سے آپ تخفیف کرتے، جیسے بچوں کا رونا وغیرہ، اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ درمیان وقت میں نماز شروع کرتے تو تخفیف کرتے۔

مغرب کی نماز میں قرأت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ام الفضل رضی اللہ عنہا نے انہیں "والمرسلات عرفا" پڑھتے ہوئے سنا، پھر کہا کہ اے بیٹے! تم نے اس سورت کی تلاوت کر کے مجھے یاد دلا دیا، میں آخر عمر میں نبی کریم ﷺ کو مغرب میں یہی سورہ پڑھتے ہوئے سنتی تھی۔

مطعم بن عدی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب میں سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا تھا۔(۶)

(۱) سنن ابی داود ح ۸۰۶۔ (۲) سنن ابی داود ح ۸۰۷۔
(۳) سنن نسائی ۵۰۳/۲۔ (۴) سنن نسائی ۵۰۳/۲۔
(۵) صحیح بخاری مع الفتح ۳۱۴/۲۔ (۶) صحیح بخاری مع الفتح ۳۱۵/۲۔

عبداللہ بن عتبہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورہ "حم الدخان" پڑھی ۔(۱)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب کی نماز کے دونوں رکعتوں میں سورہ "اعراف" پڑھی ۔(۲)

نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ کو مغرب کی نماز میں "سبح اسم ربك الأعلى" اور "والشمس وضحاها" یا اسی جیسی سورتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔(۳)

حضرت سلیمان بن یسار نے بیان کیا کہ فلاں صاحب ظہر کی پہلی دو رکعتیں لمبی کرتے ہیں اور نماز عصر میں تخفیف کرتے ہیں اور نماز مغرب میں قصار مفصل اور عشاء میں وساط مفصل اور صبح کی نماز میں طوال مفصل پڑھتے ہیں، تو ابو ہریرہ ؓ نے کہا میں نے کسی کی امامت میں اس سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی نماز سے مشابہ نماز نہیں پڑھی ۔(۴)

ابو عثمان النہدی سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن مسعود کے پیچھے مغرب کی نماز پڑھی تو انہوں نے "قل هو الله أحد" کی تلاوت کی ۔(۵)

رافع بن خدیج روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز مغرب نبی کریم ﷺ کے ساتھ پڑھتے تھے پھر ہم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہوکر واپس ہوتا (تو اتنی دیر روشنی باقی ہوتی) کہ تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ لیتا ۔(متفق علیہ) یعنی نماز ادا کرنے میں جلدی کرتے تھے اور مختصر قرأت کرتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق ؓ سے روایت ہے کہ وہ مغرب میں قصار مفصل پڑھا کرتے تھے ۔(۶) اس اثر کو ذکر کرنے کے بعد امام ترمذی لکھتے ہیں: "وعلى هذا العمل عند أهل العلم" (۷) اسی پر اہل علم کا عمل ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مغرب میں آپ کی قرأت پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ اس میں مختلف مقداروں کی سورتوں کی تلاوت کی ہے، چنانچہ اعراف سبع طوال میں سے ہے اور طور طوال مفصل میں سے ہے جبکہ مرسلات وساط مفصل میں سے ہے، ان حدیثوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ عموماً نماز مغرب میں مختصر ہی پڑھتے تھے جیسا کہ متفق علیہ روایت سے معلوم ہوتا ہے اور کبھی کبھی مغرب میں آپ طویل قرأت کرتے تھے یا تو بیان جواز کے لئے یا اس وجہ سے کہ آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ مقتدیوں پر شاق نہیں ہوگا۔(فتح الباری ۲/۳۱۶)

(۱) سنن نسائی ۲/۵۰۹۔ (۲) ایضاً ۲/۵۰۹۔ (۳) صحیح مسلم مع النووی ۲/۳۱۶۔

(۴) نسائی (نوٹ) قرآن کا آخری حصہ جو چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل ہے اس کا نام مفصل ہے، مشہور قول کے مطابق اس کا آغاز سورہ حجرات سے ہوتا ہے اور انتہا آخر قرآن تک، مفصل کی تین قسمیں ہیں: طوال مفصل: سورہ حجرات سے سورہ بروج تک، اور وساط مفصل: سورہ بروج سے سورہ بینہ تک، اور قصار مفصل: سورہ بینہ سے قرآن مجید کے اختتام تک۔

(۵) سنن ابی داود ۱/۵۱۰۔ (۶) جامع الترمذی ۲/۱۱۳۔ (۷) ایضاً۔

عشاء کی نماز میں قرأت

حضرت براء ؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو عشاء کی نماز میں "والتین والزیتون" پڑھتے ہوئے سنا، میں نے آپ سے زیادہ اچھی آواز یا اچھی قرأت والا کسی کو نہیں پایا۔(۱)

بکر بن رافع کہتے ہیں کہ میں نے ابو ہریرہ ؓ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، اس میں آپ نے "اذا السماء انشقت" پڑھی اور سجدہ تلاوت کیا، میں نے ان سے اس کے متعلق معلوم کیا تو بتلایا کہ میں نے ابو القاسم ﷺ کے پیچھے بھی سجدہ کیا ہے اور زندگی بھر میں سجدہ کروں گا، یہاں تک کہ میں آپ سے مل جاؤں ۔(۲)

حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ معاذ بن جبل ؓ اپنے اصحاب کو عشاء کی نماز پڑھائی تو قرأت لمبی کی، ہم میں سے ایک شخص نے نماز توڑ دی اور اکیلے پڑھ لی، معاذ کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا وہ منافق ہے۔ جب یہ خبر اس شخص کو پہنچ گئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور معاذ نے جو کہا تھا وہ بیان کیا، آپ ﷺ نے معاذ سے کہا اے معاذ تم فسادی ہونا چاہتے ہو جب تو امامت کرے تو "والشمس وضحاها" اور "سبح اسم ربك الأعلى" اور "اقرأ باسم ربك الذى خلق" اور "والليل اذا يغشى" پڑھو۔(۳)

حضرت عبد اللہ بن بریدہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز میں "والشمس وضحاها" اور اسی کے مانند سورتیں پڑھا کرتے تھے۔(۴)

فجر کی نماز میں قرأت

ابو برزہ اسلمی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں عموما ساٹھ سے سو آیات کی تعداد تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔(متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن کی پہلی رکعت میں "الم تنزيل" اور دوسری رکعت میں "هل أتى على الانسان" پڑھا کرتے تھے۔(۵)

ام سلمہ ؓ نے کہا کہ میں نے لوگوں کے پیچھے ہو کر کعبہ کا طواف کیا اس وقت نبی کریم ﷺ نماز میں سورہ طور پڑھ رہے تھے۔(۶)

(۱) صحیح بخاری مع الفتح ۲/۳۱۹۔ (۲) صحیح بخاری مع الفتح ۲/۳۱۹۔
(۳) صحیح مسلم مع النووی ۲/۴۱۸۔ (۴) جامع الترمذی ۲/۱۱۶۔
(۵) صحیح بخاری مع الفتح ۲/۴۷۹۔ (۶) صحیح بخاری ۲/۳۳۱ (معلقا)

عبداللہ بن سائب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں فجر کی نماز پڑھائی اور سورہ "مومنون" شروع کی، یہاں تک کہ موسی اور ہارون علیہما السلام یا عیسی علیہ السلام کا ذکر آیا تو نبی کریم ﷺ کو کھانسی آنے لگی اور آپ نے رکوع کردیا۔(۱)

عمر بن حریث کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فجر کی نماز میں " واللیل اذا عسعس " پڑھتے ہوئے سنا۔(۲)

جابر بن سمرہ ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فجر کی نماز میں "ق والقرآن المجید" پڑھتے تھے۔(۳)

معاذ بن عبداللہ جہنی کہتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی نے ان کو خبر دی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فجر کی نماز کے دونوں رکعتوں میں "اذا زلزلت الأرض" پڑھتے ہوئے سنا، راوی کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا آپ نے عمداً ایسا کیا ہے یا نسیانا۔(۴)

عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے معوذتین کو پوچھا، آپ نے فجر کی نماز میں ان ہی دونوں سورتوں کو پڑھا۔(۵)

عمرو بن حریث کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فجر کی نماز میں "اذا الشمس کورت" پڑھتے ہوئے سنا۔(۶)

ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی پہلی رکعت میں "قولوا آمنا باللہ وما أنزل الینا" اخیر آیت تک جو سورہ بقرہ میں ہے پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں "آمنا باللہ واشھد بأنا مسلمون" پڑھتے۔(۷)

عمرو بن حریث کہتے ہیں کہ میں نے فجر کی نماز میں نبی کریم ﷺ کی آواز سنی، آپ "فلا أقسم بالخنس الجوار الکنس" پڑھ رہے تھے۔(۸)

جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز میں سورۃ الواقعہ پڑھا۔(۹)

حضرت عمر ؓ نے ابو موسی اشعری کو لکھا کہ صبح کی نماز میں طوال مفصل اور ظہر کی نماز میں وساط مفصل اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل پڑھا کرو۔(رواہ ابو حفص باسنادہ)

---

(۱) صحیح مسلم مع النووی ۴/۴۱۳۔ (۲) صحیح مسلم مع النووی ۴/۴۱۳۔
(۳) صحیح مسلم مع النووی ۴/۴۱۴۔ (۴) سنن ابی داود ۱/۵۱۱۔
(۵) سنن نسائی ۴/۴۹۴۔ (۶) سنن نسائی ۴/۴۹۵۔
(۷) سنن نسائی ۴/۴۹۳۔ (۸) سنن ابی داود ۱/۵۱۱۔
(۹) مصنف عبدالرزاق۔

امام ابن قدامہ لکھتے ہیں: "وکان علیه السلام یطیل تارة ویقصر أخری بحسب الأحوال وروی أنه قال علیه السلام: "انی لأدخل فی الصلاة وأنا أرید أن أطیلها فأسمع بکاء الصبی فاخفف مخافة أن أشق علی أمه" (صحیح البخاری، المغنی ۲/۲۷۵) یعنی نبی کریم ﷺ مقتضی حال کے مطابق کبھی نماز لمبی کرتے تھے اور کبھی مختصر پڑھتے تھے، نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ میں نماز میں داخل ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ نماز لمبی کروں لیکن بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز میں تخفیف کردیتا ہوں تاکہ اس کی ماں مشقت میں نہ پڑ جائے۔

امام نووی لکھتے ہیں: "وأما اختلاف قدر القرأة فی الصلوات فهو عند العلماء علی ظاهره ...... الخ" یعنی نمازوں میں قرأت کا اختلاف تو علماء کے نزدیک اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے گا، محققین نے مزید کہا ہے کہ سنت یہ ہے کہ صبح اور ظہر میں طوال مفصل پڑھی جائے لیکن صبح کی نماز ظہر سے لمبی پڑھی جائے گی اور عشاء وعصر میں وساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل پڑھی جائے، فجر اور ظہر کی تطویل میں حکمت یہ ہے کہ یہ دونوں نمازیں غفلت کے اوقات میں پڑھی جاتی ہیں، اس طرح کہ فجر نیند کے غلبہ کے وقت پڑھی جاتی ہے اور قیلولہ کی وجہ سے ظہر بھی غفلت کے وقت پڑھی جاتی ہے، اور عصر کا معاملہ اس کے برخلاف محنت ومشقت کے وقت پڑھی جاتی ہے، اس لئے اس میں تخفیف کی جائے گی اور مغرب کا وقت چونکہ مختصر ہوتا ہے، اس لئے اور زیادہ تخفیف کے ساتھ پڑھی جائے گی اور عشاء کا وقت نیند کے غلبہ کا ہوتا ہے، اگرچہ اس کا وقت وسیع ہے، اس لئے ایک طرح سے یہ عصر کے مشابہ ہے، واللہ اعلم۔ (شرح صحیح مسلم للنووی ۲/۴۱۰)

گذشتہ احادیث پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عموما پہلی رکعت کو لمبی کرتے تھے، علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: "ویستحب أن یطیل الرکعة الأولی من کل صلاة لیلحقه القاصد للصلاة" (المغنی ۲/۲۷۷) یعنی مستحب یہ ہے کہ ہر نماز کی پہلی رکعت کو لمبی کی جائے تاکہ نماز کا قصد کرنے والا نماز پا جائے چنانچہ ابو قتادہ سے روایت ہے کہ: "أن النبی ﷺ کان یقرأ فی الرکعتین الأولیین من الظهر بفاتحة الکتاب وسورتین، یطول فی الأولی، ویقصر فی الثانیة ویسمعنا الآیة أحیانا، وکان یقرأ فی العصر فی الرکعتین الأولیین بفاتحة الکتاب وسورتین، یطول فی الأول ویقصر فی الثانیة، وکان یطول فی الرکعة الأولی من صلاة الصبح ویقصر فی الثانیة". (صحیح البخاری ۱/۱۹۳) یعنی نبی کریم ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے، پہلی رکعت میں طویل قرأت کرتے اور دوسری رکعت میں مختصر، کبھی کبھی آپ کوئی آیت ہمیں سنا بھی دیا کرتے تھے، اسی طرح عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے، پہلی رکعت میں طویل قرأت کرتے اور

دوسری میں مختصر، اور آپ فجر کی پہلی رکعت میں طویل قرأت کرتے اور دوسری میں مختصر۔

اسی طرح ایک رکعت میں مکمل سورہ نہ پڑھ کر اگر بعض حصہ پڑھنے پر اکتفا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ زید بن ثابت سے روایت ہے کہ: "أن النبي ﷺ قرأ في المغرب بالأعراف كلتيهما" یعنی نبی کریم ﷺ نے مغرب کی نماز کے دونوں رکعتوں میں سورہ اعراف پڑھی۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک ہی سورہ کو دونوں ہی رکعتوں میں پڑھتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ صحیح حدیث میں ہے: "أن النبي ﷺ صلى المغرب فقرأ بأم الكتاب وقرأ معها اذا زلزلت ثم قام فقرأ في الثانية بأم القرآن وقرأ اذا زلزلت أيضا" (ابوداود) یعنی نبی کریم ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی تو اس میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ اذا زلزلت پڑھی پھر آپ دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے اور اس میں بھی سورہ فاتحہ اور اذا زلزلت پڑھی۔

خلاصۂ کلام:

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ مخصوص سورتوں کو مخصوص نمازوں میں پڑھنا واجب وضروری نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے، چنانچہ صحابۂ کرام ؓ ان کے علاوہ چھوٹی بڑی سورتوں کی بھی تلاوت کرتے تھے، اس سلسلے میں امام بخاری نے چند آثار ذکر کئے ہیں: "قرأ عمر في الركعة الأولى بمائة وعشرين آية من البقرة وفي الثانية بسورة من المثاني" (صحیح بخاری ۲/ ۳۲۴) یعنی حضرت عمر (فجر) کی پہلی رکعت میں سورہ بقرہ کے ایک سو بیس آیتیں پڑھی اور دوسری رکعت میں مثانی کی کوئی سورہ۔ (مثانی: وہ سورتیں ہیں جن کی آیتیں سو یا اس سے کم ہو)۔

"وقرأ الأحنف بالكهف في الأول وفي الثانية بيوسف أو يونس وذكر أنه صلى مع عمر الصبح بهما" (صحیح بخاری ۲/ ۳۲۴) یعنی احنف نے پہلی رکعت میں کہف اور دوسری رکعت میں یوسف یا یونس پڑھی اور کہا کہ انہوں نے عمر کے ساتھ صبح کی نماز اسی طرح پڑھی ہے۔

"وقرأ ابن مسعود بأربعين آية من الأنفال وفي الثانية بسورة من المفصل" (صحیح بخاری ۲/ ۲۲۴) کہ ابن مسعود نے سورہ انفال کی چالیس آیات پہلی رکعت میں اور دوسری رکعت میں مفصل کی کوئی سورت پڑھی۔



مولود کعبہ کون: حضرت علیؓ یا حکیم بن حزامؓ؟

امیر الاسلام بحر الحق

تاریخ اسلام سے شغف رکھنے والا ہر فرد اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ جس دن مرغزار عرب سے اسلام کا ظہور ہوا، وہیں سے اسلام دشمنی کا سلسلہ بھی شروع ہوا، اور سلسلہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، مشرکین مکہ ہوں یا مدینہ اور اس کے نواحی کے یہود ونصاری کسی نے بھی اسلام کی عظمت وبرتری اور کامیابی وکامرانی کو برداشت نہیں کیا، تاہم پوری اسلامی تاریخ میں جو قوم سب سے زیادہ اسلام دشمنی میں معروف ومشہور رہی وہ قوم یہود ہے، یقیناً اس باطل پرست مکار قوم نے اسلام کے خلاف جن حیلوں اور حربوں کا استعمال کیا وہ انتہائی خطرناک ثابت ہوئے، شیعی عقائد کی ترویج واشاعت اسی قوم کا دین ہے، شیعیت کا موجد دشمن اسلام عبداللہ بن سبا یہ وہی یہودی ہے جس نے حب آل بیت کا جھوٹا دعوی ٹھونک کر اسلام اور مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں اہم رول ادا کیا، پھر اس کے متبعین نے بھی سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کے لئے بے شمار جھوٹے اور من گھڑت واقعات وقصص کا سہارا لیا، انہیں افسانوی قصوں اور جھوٹے اختراعات میں سے ایک اختراع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یقینی طور پر مولود کعبہ بتانا بھی ہے۔

پیش نظر مقالہ میں اس بات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے کہ مولود کعبہ کون؟ حضرت علیؓ یا حکیم بن حزامؓ؟

شیعی روایات واقوال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مولود کعبہ ثابت کرنے کے لئے شیعوں کی طرف سے یا ان کے ہم خیالوں کی طرف سے جو روایات یا اقوال پیش کئے جاتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- امام حاکم نے حکیم بن حزامؓ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "وقد تواترت الأخبار أن فاطمة بنت أسد ولدت أمير المؤمنين علي بن أبي طالب كرم الله وجهه في جوف الكعبة" (۱) یعنی یہ تواتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کعبہ کے اندر جنا۔

۲- علامہ ابن ظہیرہ نے اپنی کتاب "الجامع اللطیف" بصیغہ مجہول یہ قول نقل کیا کہ حضرت علیؓ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔(۲)

(۱) المستدرک علی الصحیحین ۳/۴۸۳۔ (۲) الجامع اللطیف: ۳۴۸، بحوالہ اخبار الکرام باخبار المسجد الحرام: ۱۹۲۔

۳- اس سلسلے میں سب سے مشہور روایت جو نقل کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''حلیمہ بنت ابی ذویب عبداللہ بن الحارث سعدیہ ایک مرتبہ حجاج بن یوسف کے دورِ خلافت میں ان سے ملنے کے لئے گئیں، حجاج نے کہا: اے حلیمہ! اللہ نے تجھے میرے پاس لایا، میں چاہتا تھا کہ تجھے بلاؤں اور تم سے انتقام لوں، حلیمہ نے کہا: اس سورش وغصہ کا کیا سبب ہے؟ حجاج نے جواب دیا: میں نے سنا ہے کہ تم حضرت علیؓ کو ابوبکرؓ وعمرؓ پر فضیلت دیتی ہو، حلیمہ نے کہا: حجاج! خدا کی قسم میں اپنے امام کو اکیلی حضرت عمر وابوبکر پر فضیلت نہیں دیتی ہوں، ابوبکر وعمر میں کیا لیاقت ہے کہ حضرت علیؓ سے ان کا موازنہ کیا جائے، میں تو اپنے امام کو آدم، نوح، ابراہیم، سلیمان، موسیٰ اور عیسیٰ پر بھی فضیلت دیتی ہوں، حجاج نے برآشفتہ ہوکر کہا کہ میں تجھ سے دل برداشتہ ہوں، میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے، اگر تو نے اس دعوی کو ثابت کردیا تو ٹھیک ورنہ میں تجھے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا، تاکہ تم دوسروں کے لئے عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے، پھر حلیمہ نے ایک ایک کرکے دلائل کے ساتھ حضرت علیؓ کی برتری ثابت کردیا یہاں تک کہ جب حجاج نے کہا تو کس دلیل سے حضرت علیؓ کو عیسیٰ علیہ السلام پر ترجیح دیتی ہے؟ حلیمہ نے کہا کہ اے حجاج سنو! جب مریم بنت عمران بچہ جننے کے قریب ہوئی جب کہ وہ بیت المقدس میں ٹھہری تھیں، حکم الٰہی آیا کہ بیت المقدس سے باہر نکل جاؤ اور جنگل کی طرف رخ کرو تاکہ بیت المقدس تیرے نفاس سے ناپاک نہ ہوجائے، اور جب حضرت علیؓ کی ماں فاطمہ بنت اسد وضع حمل کے قریب ہوئیں تو وحی ہوئی کہ کعبہ میں داخل ہوجاؤ اور میرے گھر کو اس مولود کی پیدائش سے مشرف کر، پھر حلیمہ کہنے لگی اے حجاج اب تم ہی انصاف کرو کہ ان دونوں بچوں میں کون شریف ہوگا؟ حجاج یہ سن کر راضی ہوگیا اور حلیمہ کے لئے وظیفہ بھی مقرر کردیا۔(۱)

۴- ایک روایت امام زین العابدین کی طرف یوں منسوب کی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا: أخبر مني زهدة بنت عجلان الساعدية عن أم عمارة بنت عبادة الساعدية انها قالت: كنت ذات يوم في النساء من العرب إذا أقبل أبو طالب كئيبا، فقلت له: ما شأنك فقال: ان فاطمة بنت أسد شدة من الطلق وانها لا تضع ثم انه أخذ بيدها وجاء بها إلى الكعبة فدخل بها وقال اجلسي على اسم الله، فجلست وطلقت طلقة فولدت غلاما نظيفا فسماه أبو طالب عليا. (۲)

یعنی ام عمارہ بنت عباد الساعدیہ کی طرف سے زہدہ بنت عجلان الساعدیہ نے مجھے خبر دی، کہا کہ میں ایک دن عرب کی چند عورتوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ابوطالب غمگین ہوکر آیا، میں نے کہا: تمہارا حال کیا ہے؟ تو ابوطالب نے کہا: فاطمہ بنت اسد دردِ زہ میں مبتلا ہے اور وقت ہوجانے کے باوجود بچہ پیدا نہیں ہو رہا ہے، پھر ابوطالب اپنی بیوی فاطمہ کو خانۂ کعبہ کے اندر لے آیا،

(۱) آئینہ مذاہب امامیہ ترجمہ اردو وتحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی ص۱۱۱-۱۱۲۔

(۲) آئینہ مذاہب امامیہ ترجمہ اردو تحفہ اثنا عشریہ: ۱۱۹۔

اورکہا کہ اللہ کے نام پر بیٹھ جاؤ، بیٹھ گئی اورپھر دردزہ شروع ہوگیا، اورایک پاکیزہ بچہ پیدا ہوا، جس کا نام ابوطالب نے علی رکھا۔

یہ ہیں وہ روایات جن کی بنیاد پر حضرت علیؓ کومولودکعبہ کہا جاتا ہے آئندہ سطور میں ان روایات کا تحقیقی جائزہ ملاحظہ فرمائیں:

پہلی روایت: اس میں امام حاکم نے تواتر کا دعوی کیا ہے، حالانکہ قابل اعتبار وقابل اعتماد مورخین میں سے کسی نے بھی اس بات کا یقین کے ساتھ تذکرہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے تھے، لہٰذا یہاں تواتر کا معنی پایا نہیں جاتا۔

● نہج البلاغۃ کے شارح علامہ ابن ابی الحدید اس روایت کونقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سیدنا علی علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے، تاہم محدثین کرام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مولودکعبہ ہونے کوتسلیم نہیں کیا ہے اوراس روایت کومحض جھوٹ واختراع قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جن کی ولادت ہوئی وہ حکیم بن حزام بن خولد ہیں۔(۱)

دوسری روایت: ابن ظہیرہ نے بصیغہ مجہول یہ بیان کیا ہے: "قيل: انه ولد بالكعبة" یعنی یہ کہ حضرت علیؓ کعبہ میں پیدا ہوئے اوراس مجہول کے مقابل میں ایک معروف قول بھی نقل کیا اوراس میں حضرت علیؓ کی جائے پیدائش وہ جگہ بتلائی گئی ہے جوشعب علی سے مشہور ہے اور وہ نبی ﷺ کی جائے پیدائش سے قریب میں واقع ہے۔(۲) لہٰذا مولود کعبہ ہونے کی روایت مرجوح ہے۔

● گیارہویں صدی ہجری کے نامور مصنف احمد بن محمد الاسدالمکی نے ابن ظہیرہ کے بصیغہ مجہول نقل کردہ قول "انه ولد بالكعبة" کوامام نوویؒ کے قول کے ذریعہ ضعیف قرار دیا ہے۔(۳)

تیسری روایت: اس روایت میں جوواقعہ بیان کیا گیا ہے وہ سرتاپا جھوٹ وکذب اور بہتان سے لبریز ہے، کیونکہ:

● تراجم کی کتاب میں کہیں یہ مذکورنہیں کہ حلیمہ بنت ابی ذویب السعد یہ حجاج بن یوسف کے عہد تک زندہ تھیں اورنہ ہی کہیں کسی نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔(۴)

● آئینہ مذاہب امامیہ کے مصنف علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: ''حلیمہ بنت ابی ذویب مورخین کے اتفاق رائے سے حجاج بن یوسف کے زمانے تک زندہ نہیں رہی''۔(۵)

● اس روایت کوصحیح ماننے سے اہل السنۃ والجماعۃ کے اصولوں کی مخالفت لازم آئے گی کیونکہ اس روایت میں حضرت علیؓ کوعمرین (ابوبکروعمر) پرفوقیت دینے کی کوشش کی گئی ہے، جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تمام صحابہ کرام میں

(۱) شرح نہج البلاغۃ لابن الحدید ۱/۱۴، بحوالہ المرتقی لابی الحسن الندوی ص ۴۹۔
(۲) الجامع اللطیف ص ۳۴۸، بحوالہ اخبار الکرام باخبار المسجد الحرام، جامعہ سلفیہ بنارس، ص: ۱۹۴۔
(۳) ایضا، ص: ۱۹۴۔ (۴) ملاحظہ ہو: سیرت ابن ہشام ۱/۱۶۹، اسدالغابۃ ۶/۷۸۔ (۵) تحفہ اثناعشریہ ص ۱۱۴۔

سب سے افضل حضرت ابو بکر پھر عمر پھر عثمان پھر حضرت علی اور پھر بقیہ عشرہ مبشرہ ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔(۱)

● خود حلیمہ سعدیہ کے ایمان لانے اور نہ لانے کے سلسلے میں بھی مورخین کا اختلاف ہے۔(۲)

● اس اختلاف سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت سعدیہ بعثت نبوی کے آخری دور سے پہلے ہی وفات پا گئی تھیں، اگر اس زمانے تک باحیات ہوتیں تو ان کے ایمان سے متعلق اختلاف منقول نہیں ہوتا۔

● عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے متعلق جو بات اس روایت میں کہی گئی ہے وہ محض بکواس ہے اور تاریخ کے خلاف ہے کسی مورخ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کے برخلاف نص قرآن اس بات پر واضح دلالت کرتی ہے کہ مریم علیہ السلام دردزہ سے پریشان ہوکر اس بات پر آمادہ ہوئیں کہ وہ کسی چیز پر تکیہ کریں اور جب اس حالت میں جنگل میں جانا اور کسی کی مدد کے بغیر وضع حمل کا ہونا دشوار محسوس کیا تو انہوں نے بے اختیار ہوکر موت کی خواہش کی۔ فأخذها المخاض إلى جذع النخلة، قالت يا ليتني مت قبل هذا أو كنت نسيا منسيا. (۳)

● اور یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ فاطمہ بنت اسد کو بھی وحی ہوئی کہ خانہ کعبہ میں جاکر وضع حمل کرے، یہ بالکل جھوٹ ہے، کیونکہ اسلامی اور غیر اسلامی فرقوں میں سے کوئی بھی فاطمہ بنت اسد کی نبوت کا قائل نہیں ہے، جبکہ یہاں وحی جو لفظ ہے وہ انبیاء کے لئے خاص ہے۔

چوتھی روایت: امام زین العابدین کی طرف منسوب روایت پر جرح کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ صحیح اسلامی تاریخ کے خلاف یہ محض بکواس ہے۔(۴)

● میں کہتا ہوں کہ شیعیت کے پیروکار جس قدر حضرت علیؓ کو مولودِ کعبہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے دلائل اتنے ہی بے وقعت اور کمزور ہیں اور سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کے لئے ایک اختراع ہے۔ کیونکہ:

● خانہ کعبہ جیسے معزز گھر میں کسی کی بھی ولادت ہو وہ ایک عظیم شہرت کی بات ہے، مورخین اس کا تذکرہ ہرگز ترک نہیں کرسکتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ:

۱- امام سیوطی نے اپنی کتاب ''تاریخ الخلفاء'' میں تقریبا ۲۲ رصفحات پر حضرت علیؓ کے فضائل کو بیان کیا ہے، اس میں مولودِ کعبہ ہونے کا ذکر نہیں۔(۵)

۲- امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''تاریخ اسلام ووفیات الاعیان'' میں تقریبا ۳۲ رصفحات پر حضرت علیؓ کی ولادت

(۱) مجموع فتاوی ابن تیمیہ ۴/۱۵۲۔ (۲) تحفہ اثناعشریہ ص ۱۱۹۔
(۳) مریم: ۲۳۔ (۴) تحفہ اثناعشریہ: ۱۱۹۔
(۵) تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۸۵-۲۰۷۔

سے لیکر وفات تک زندگی کے مختلف گوشوں پر بحث کی ہے اور بے شمار خصوصیات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس میں **مولود** کعبہ ہونے کا ذکر نہیں ہے۔(۱)

۳- **استیعاب** ابن عبدالبر نے ۴۰ سے زائد صفحات پر خصائص علیؓ کا اور دیگر چیزوں کا **مفصل** تذکرہ کیا ہے، لیکن **مولود** کعبہ ہونے کی **بات** نہیں لکھی ہے۔(۲)

ان کے علاوہ **قابل** ذکر ومعتبر مورخین ومحدثین میں سے ابن **الاثیر** نے اپنی کتاب اسد **الغابۃ** ۴/۱۰۰-۱۳۴ میں، ابونعیم اصفہانی نے معرفۃ الصحابۃ ۱۹۶۸-۱۹۷۰ میں امام مزی نے تہذیب الکمال ۲۰/۴۷۲ میں امام مسلم نے "**باب** من فضائل علی ابن أبي طالب" میں اور امام المحدثین محمد بن عبداللہ بن اسماعیل بخاریؒ نے "**باب** مناقب علی بن ابی طالب" میں حضرت **علیؓ** کے بے شمار فضائل کا ذکر کیا ہے، لیکن کہیں بھی کسی نے **مولود** کعبہ ہونے کی **بات** نہیں لکھی، اس کے برخلاف حکیم بن حزام کے بارے میں جس نے بھی **قلم** اٹھایا تقریباً سبھی **لوگوں** نے ان کے **مولود** کعبہ ہونے کی **بات** کہی ہے، **مثلاً** اسد **الغابۃ** (۲/۵۸) میں، تہذیب الکمال (۷/۱۷۳)، تاریخ اسلام (۲/۲۷۷) میں، **الاصابۃ** (رقم: ۱۸۰۰) میں، تہذیب التہذیب (۲/۴۴۷) میں، البدایۃ والنہایۃ (۸/۶۸) میں، **الاستیعاب** (۱/۳۶۲) میں، جمہرۃ انساب **العرب** (۱۲۱) میں، **مذکورہ** تمام کتابوں کے مصنفین نے حکیم بن حزامؓ کے بارے میں **مولود** کعبہ ہونے کی **بات** کہی ہے۔

خلاصۂ کلام: یہ مذکورہ حقائق اس **بات** پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت **علیؓ** کو مولود کعبہ بتانا ایک اختراع باطل ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، صحیح تاریخ سے جو ثابت ہے وہ یہی ہے کہ حکیم بن حزامؓ ہی کعبہ میں پیدا ہوئے، تاہم حضرت **علیؓ** کی **ولادت** کہاں ہوئی؟ اس میں سب سے زیادہ صحیح اور راجح **قول** یہی ہے کہ ان کی پیدائش نبی کریم ﷺ کی جائے پیدائش سے قریب ایک گھاٹی میں ہوئی جو کہ شعب علی سے معروف ہے۔(۳)

لہٰذا بے اصل روایتوں کو سہارا بنا کر حضرت **علیؓ** کو مولود کعبہ بتانے کی کوئی **ضرورت** نہیں، اس سے حضرت **علیؓ** کی ذات میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ بے شک حضرت علیؓ کی ذات عبقری ہے، اور بے شمار فضائل کا مالک ہے، جھوٹے **واقعات** وقصص سے **بالکل** بے نیاز ہے۔

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل وارزقنا اجتنابه، انك جواد كريم، وصلى الله على النبي الأمين.

☆☆☆

(۱) تاریخ الاسلام للذہبی: ۶۲۱-۶۵۴۔　(۲) استیعاب ۳/۱۰۸۹-۱۱۳۴۔
(۳) الجامع اللطیف ص ۳۴۸ بحوالہ اخبار الکرام باخبار المسجد الحرام ص ۱۹۲۔

شیخ زماں حضرت مولانا عبدالرحیم جھمکاوی

(۱۲۷۰-۱۳۲۵ھ)

(قسط:۳)

مولانا محمد حنیف مدنی/ استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

مولانا عبدالرحیم مولانا عبدالہادی کے دوسرے فرزند ارجمند اور مولانا عبدالکریم مسلم کے دوسرے حقیقی بھائی تھے،آپ ۱۲۷۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے،ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور اعلی تعلیم کے لئے آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو علامہ محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے پاس بھیجا،آپ نے ان سے تفسیر،حدیث اور دوسرے علوم کی تحصیل کی اور تقریر وتحریر میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد آپ کلکتہ یونیورسٹی میں مدرس مقرر ہوئے اور وہیں ایک یہودی کمشنر کے لڑکے کو کلکتہ یونیورسٹی میں تعلیم دے رہے تھے اور اسی لڑکے کے ذریعہ کمشنر سے باتیں ہوئیں تو آپ نے بتایا کہ میرا پورا خاندان انگریزی حکومت کے عتاب میں پھنسا ہوا ہے،انگریزی سرکار سے ہمارے خاندان کی رہائی کے لئے کوشش کی جائے،اس کمشنر نے گورنر جنرل سے خط وکتابت کی اور درخواست کی اور اسی کی جد وجہد کے ذریعے وارنٹ ختم ہوا تو آپ کلکتہ سے اپنے وطن جھمکا تشریف لائے اور علاقے میں پھیلے ہوئے شرک وبدعت کے رسم ورواج کی بیخ کنی کی اور علوم کتاب وسنت کی نشر واشاعت میں ہمہ تن لگے رہے۔

ایک دوسری روایت آپ کی تعلیم کے سلسلے میں یہ ہے کہ آپ کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔

علمی مقام ومرتبہ: آپ ایک بہت بڑے خطیب،زبردست عالم اور مناظر پیدا ہوئے،آپ نصوص شرعیہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے،یہی وجہ ہے کہ آپ بنگال کے اکثر وبیشتر شہروں،قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرتے رہتے تھے،آپ اپنے والد مولانا عبدالہادی صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دعوت وتبلیغ اور وعظ وارشاد کے ساتھ ساتھ اہل بدعت کے جید علماء سے آپ نے مناظرہ کرکے مخالف کو لاجواب بھی کیا ہے۔

منہج ومسلک: آپ کا مسلک وہی تھا جو صحابۂ کرام،تابعین عظام،اتباع تابعین اور سلف صالحین کا تھا،آپ پکے سچے اہل حدیث اور سلفی المسلک عالم دین تھے،کتاب وسنت کی تعلیمات ہی کو جاری وساری دیکھنا چاہتے تھے،آپ تقلید شخصی سے کوسوں دور اور شرکیہ وبدعیہ اعمال سے بالکل بیزار تھے۔

تصنیف: آپ نے ایک کتاب بنام ''جنگ وجدال بتیا'' لکھا تھا۔

وفات: آپ کی وفات ۱۳۲۵ھ کو جھمکا میں ہوئی،سرزمین جھمکا میں آپ مدفون ہیں۔

اولاد: آپ کے ایک لڑکے مولانا علی مظہر تھے اور تین لڑکیاں تھیں:(۱)انیسہ خاتون (۲) زبیدہ خاتون (۳) خدیجہ خاتون۔

مصدر

(۱) تذکرۂ ڈاکٹر عبدالماجد۔
(۲) خطبۂ استقبالیہ برائے صوبائی کانفرنس،مرجدا ضلع مغربی چمپارن ۱۹۷۵ء،از نجم الہدی انجم جھمکاوی۔
(۳) تاریخ جھمکا (قلمی) از فراق الاعظم انجینئر جھمکاوی۔

سگریٹ کا دھواں کینسر کا اصل سبب

ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی/نئی دہلی

امریکہ کے سائنسدانوں نے تحقیق کی ہے کہ تمباکو کا دھواں بعض سلسلہ وار کیمیائی تعملات کی ابتدا کرتا ہے جو بالآخر سیلس کی افزائش یعنی ٹیومر بننے کا سبب ہوتے ہیں۔ کارنیل یونیورسٹی اور نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ، میری لینڈ کے سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے اس مفروضے کی بنیاد پر ایک دوا کو ٹیسٹ کیا جو ایروڈائی جیسٹیو ٹریکٹ (Aero-Digestive Tract منہ سے معدے تک ہضمی نالی کا حصہ) کینسر پیدا کرنے والے سلسلہ وار کیمیائی تعملات میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے۔

مطالعہ کے نتائج جرنل آف کینسر کے حالیہ شمارے (والیوم 65، نمبر 2) میں شائع ہوئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ بھی تمباکو کے دھوئیں کے مہلک اثرات سے متاثر ہوتے ہیں جو سگریٹ نہیں پیتے۔

آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے پروفیسر پی. کے جالکا کا کہنا ہے کہ کینسر پیدا کرنے والے تعملات کا سلسلہ نکوٹین سے نہیں بلکہ ان پولی سائیکلک ایرومیٹک ہائیڈروکاربنس (Polycyclic Aromatic Hydrocarbons) سے شروع ہوتا ہے جو سگریٹ کے دھوئیں میں موجود ہوتے ہیں۔

تجربات بتاتے ہیں کہ دھواں جلن پیدا کرتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس سے ایسی علامات پیدا ہو جاتی ہیں جن میں منہ سے معدے تک ہضمی نالی میں سوزش اور سوجن پیدا ہو جاتی ہے۔ تفصیلی تحقیقات بتاتی ہیں کہ دھواں دو لگینڈس (Ligands) کے نکلنے کو بڑھاوا دیتا ہے، جنہیں ایمفی ریگولن (Amphiregulin) کہتے ہیں اور وہ پیچیدہ پروٹین مالیکولس ہیں، ان کے ذریعے سیل کی جھلی میں موجود گروتھ فیکٹر oc ٹائروسین کائنیس (Tyrosine Kinase) میں تبدیلی عمل میں آتی ہے، یہ لگینڈس سے جڑنے کے بعد سرگرم ہو جاتا ہے اور پھر سیل کے ڈی این اے میں تحریک پیدا ہوتی ہے جو آر این اے کو ایک اینزائم سائیکلو آکسی جینیز-۲ (Cyclo Oxygenase-2) (مخفف Cox-2) بنانے کا حکم دیتا ہے۔ Cox-2 سیل میں موجود ایک قسم کے فیٹی ایسڈ ایرا کی ڈونک ایسڈ (Arachidonic Acid) کو ایک دوسرے فیٹی ایسڈ پروسٹا گلینڈن (Prostaglandin) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ایسڈ سیل کی نارمل سرگرمیوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن دھوئیں کے اثر سے پروسٹا گلینڈن کی مقدار اور بالآخر ایمفی ریگولن کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس سے گروتھ فیکٹر oc کی تبدیلی عمل میں آتی ہے اور کیمیائی تعملات کا یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

پروسٹا گلینڈن ایک طرف تو سیل افزائش کو بڑھاتا ہے اور دوسری طرف سیل کے مرنے پر قدغن لگا دیتا ہے، نتیجتاً صرف سیلس کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جو بالآخر ٹیومر بنا دیتا ہے۔ تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ سگریٹ پینے والوں کی ہضمی نالی میں سگریٹ نہ پینے والوں کی نسبت چار گنا زیادہ Cox-2 پیدا ہوتا ہے۔ تحقیق کاروں نے ان تعملات کے خلاف ایک ڈرگ AG 1478 کا استعمال کیا تو پتہ چلا کہ وہ اس چکر میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے تاہم اسے علاج سمجھنے میں ابھی اور وقت درکار ہوگا۔ ☆☆

اللہ کے نام سے............

مولانا عبدالسمیع محمد ہارون انصاری سلفی
بھوارہ، مدھوبنی

مدھوبنی ضلع کے شہری حلقہ سے منتخب رہے ممبر پارلیمنٹ عبدالحنان انصاری مرحوم کے تعلق سے ان کے خواص اور قریبی لوگ جانتے ہیں کہ وہ اپنے مذہبی مزاج اور وسیع فکر وخیال کے سبب اپنی خاص شناخت رکھتے تھے، خوبی اور خامی سے کوئی بشر خالی نہیں ہے، عین ممکن ہے ان میں بھی کمی رہی ہو مگر اللہ نے ان کو ایمان اور یقین کی جو دولت دی تھی وہ بلاشبہ ان پر مالک ارض وسماں کا خاص کرم تھا، اور اللہ نے اپنے اوپر ایمان اور ان کے یقین کی لاج کیسے رکھی اس کی ایک مثال ان سے وابستہ یہ واقعہ ہے جو ان کے ایک خاص رشتہ دار اور انتہائی قریب عزیز نے ناچیز سے بتلایا، ان کا بیان ہے کہ جب وہ ۱۹۸۴ء میں مسز گاندھی کے قتل کے بعد لوک سبھا کے عام انتخاب میں مدھوبنی سے ایم پی منتخب ہوئے اور راجیو گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے حکومت بنائی، جناب انصاری مرحوم اپنے مومنانہ خو اور وضع قطع سے پہلے دن سے ہی وزیر اعظم اور ان کی اہلیہ کو متاثر کرتے رہے، نتیجۃً ان کے بے حد قریبی ہو گئے، وزیر اعظم راجیو گاندھی اور ان کی اہلیہ بصد عزت واحترام ان کو چچا اور بابا کہہ کر پکارتے تھے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ان کا اکلوتا فرزند راہل گاندھی سخت بیمار پڑ گیا، وزیر اعظم ہونے کے ناطے راجیو گاندھی نے بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے رجوع کیا مگر ان کا فرزند راہل روبہ صحت نہ ہو سکا، حتیٰ کہ ڈاکٹروں نے ان کی زندگی سے مایوسی ظاہر کردی، حالت از حد غیر تھی، ان دنوں جناب عبدالحنان انصاری مرحوم اپنے گھر مدھوبنی آئے ہوئے تھے، وزیر اعظم کے کسی قریبی اور بہی خواہ نے کہا سر! زندگی اور موت تو سب اس مالک کے ہاتھ میں ہے، پھر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر آپ کی خواہش ہو تو ان کو دَم وغیرہ کروانے کی اجازت دی جائے، پھر اس نے مسٹر عبدالحنان انصاری مرحوم کا نام تجویز کیا، آنجہانی وزیر اعظم نے بھی ان کا نام سنتے ہی حامی بھر دی، فوراً وزیر اعظم کے دفتر سے مدھوبنی کے ڈی ایم کو فون کیا گیا وہاں سے ڈی ایم بذات خود مرحوم کے آبائی گھر پہنچے اور ان سے ساری بات بتائی، مرحوم اس وقت دن کا کھانا کھا ہی رہے تھے آدھا ادھورا کھانا کھا کر کے فوراً ڈی ایم کے ہمراہ ہو گئے، اسی گاڑی سے سیکورٹی دستہ نے ان کو فوراً پٹنہ پہنچایا، پھر وہاں بذریعہ ہوائی جہاز دہلی کے لئے روانہ ہوئے، دہلی ایرپورٹ سے وہ سیدھے وزیر اعظم کی رہائش گاہ پہنچے، وزیر اعظم اور ان کی اہلیہ مرحوم انصاری کو دیکھ کر رونے لگے، اور درخواست کی چچا ہمارے بچے کے لئے اللہ سے دعا کر دیجئے، ان کا نام لیکر دم کر دیجئے کہ یہ جلد شفایاب ہو جائے، جناب مرحوم نے انہیں اپنے معلوم انداز میں مسکراتے ہوئے دونوں شوہر اور بیوی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اس کا حکم ہوگا تو وہ ضرور شفایاب ہوگا، اب جناب انصاری مرحوم تھوڑی دیر کے لئے

شش وپنج میں پڑے سوچنے لگے، انہوں نے فوراً وضو کے لئے پانی منگوایا، وضو کرنے کے بعد اسی کمرے میں دو رکعت نماز ادا کی، اور اللہ سے دعا مانگی اے الہ آج ایک تیرا بندہ تجھ سے تیرے اوپر ایمان ویقین کی لاج رکھنے کی فریاد کرتا ہے، الہا تو ہی حیات وموت کا مالک ہے، مرض وشفا سب تیرے حکم سے ہے، مالک تیرا نام لیکر میں اسے ضرور دم کرنے جارہا ہوں، پُر میری ایسی بساط نہیں کہ میں اس عظیم باپ کے عظیم بیٹے کے حق میں کچھ کرسکوں، الہا تو سب چیز پر قادر ہے، میرے مولا راہل گاندھی کو جلد از جلد اور ضرور شفا عطا فرما، دعا کے بعد جناب مرحوم نے پانی اور کڑوا تیل منگوایا، دونوں پر دَم کرنے کے بعد راہل گاندھی کو بھی دَم کردیا، تیل اور پانی سے راہل گاندھی کو دھونے اور تیل لگانے کا حکم دیا اور اس کے بعد وزیر اعظم راجیو گاندھی سے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ چائے منگوایئے ان شاء اللہ راہل جلد ہی شفایاب ہوگا، جناب انصاری مرحوم چائے پینے لگے، اللہ کا کرم دیکھئے، اس ذات باری تعالی نے اپنے ایک بندے کے یقین کی لاج کیسے رکھ لی، وہ راہل جو گھنٹوں سے بے ہوش پڑا تھا، دَم کرنے کے کچھ ہی دیر بعد ہوش میں آگیا اور خود ہی اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر کیا تھا جناب وزیر اعظم اور ان کی اہلیہ میں مسرت وتشکر کے موتی جھلملانے لگے، اور جناب انصاری مرحوم کا ہاتھ پکڑ کر ان سے خوب محبت وتشکر کا اظہار کرنے لگے، خوشی کے جذبات سے لبریز وزیر اعظم نے ان سے کہا کہ چچا آپ اس خوشی کے موقع سے ہم سے کچھ ضرور مانگئے، جناب انصاری مرحوم نے کہا کہ ہم آپ سے کیا مانگیں جبکہ دینے والا تو وہ مالک حقیقی ہے، وزیر اعظم نے کہا وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم کیا آپ کے لائق کوئی خدمت کرسکتے ہوں تو ہمیں ضرور اس کا موقع دیں، کہا کہ آپ ہمیں کیا دیجئے گا اللہ نے ہمیں یہی عزت کم دی کہ اتنے بڑے ملک کا وزیر اعظم ایک مسلمان کی اس قدر عزت کررہا ہے، اب اس سے بڑھ کر ہمارے لئے کیا بات ہوگی، وزیر اعظم کا جب اصرار ہوا تو جناب انصاری مرحوم نے کہا کہ آپ اگر کچھ کرسکتے ہیں تو ہمارے لئے نہیں ہماری پوری قوم کے لئے یہ ضرور کر دیجئے کہ پارلیمنٹ میں جمعہ کے دن نماز جمعہ کے وقت دو گھنٹہ کے لئے پارلیمنٹ کو بند کرنے کا حکم صادر ضرور فرمادیں تاکہ مسلم ایم پی اطمینان سے جمعہ ادا کرسکیں، آنجہانی وزیر اعظم نے فوراً اس کا حکم صادر فرمادیا اور تب سے آج تک پارلیمنٹ جمعہ کے دن، خواہ کتنا بھی خاص اجلاس کیوں نہ ہو، دو گھنٹہ کے لئے بند کردیا جاتا ہے، پھر جمعہ کی نماز کے بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہوتی ہے، جناب انصاری مرحوم سے متعلق اس واقعہ سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دوران پارلیمنٹ ہاؤس کے اجلاس کو بند کروانے کا سہرا ان کے سر جاتا ہے، وہیں اس سے بڑی بات یہ کہ اللہ تعالی نے ان کو اپنے اوپر ایمان ویقین کی کیسی لاج رکھ لی اور اللہ کے نام سے دم کیا گیا مریض کیسے شفایاب ہوا۔

اقبال نے جب یہ کہا تھا کہ ”جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہے زنجیریں“ تب ان کی مراد مسلمانوں کے ایمان ویقین کی عظمت ہی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا، فی الواقع ”ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ“ (جو اللہ پر یقین وتوکل رکھتا ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہے)۔ اسلامی تاریخ میں خود اس حقیقت کی شہادت کے ڈھیروں واقعات اور مثالیں ہیں۔ ☆☆

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

سالک بستوی

حالِ دلِ تباہ سنایا نہ جائے گا — جو دل میں زخم ہے وہ دکھایا نہ جائے گا
تکذیب سر پٹکتی رہے گی تمام عمر — سچائیوں کا نقش مٹایا نہ جائے گا
اب اس قدر بھی صبر ہمارا نہ آزماؤ — اتنا بھی ظلم ہم سے اٹھایا نہ جائے گا
اپنوں کے التفات نے ہی گل کھلائے ہیں — ایسا ستم تو غیر سے ڈھایا نہ جائے گا
بے لوث یار ہو تو چلیں ساتھ ساتھ ہم — خود غرضیوں کا بار اٹھایا نہ جائے گا
ہم سرفروش حق ہیں نہیں کوئی غم ہمیں — ہم سے حقیقتوں کو چھپایا نہ جائے گا
ہے روشنی کے پیچھے اندھیروں کا کیوں ہجوم؟ — کیا اب ہجوم غم کو مٹایا نہ جائے گا
کہہ دو یہ آندھیوں سے نگاہوں کو پھیر لیں — کردار کے دیئے کو بجھایا نہ جائے گا
وقعت میں خاکسار کسی سے بھی کم نہیں — مٹی میں میرا سونا ملایا نہ جائے گا
کیا خاک وہ غریب ترے کام آئے گا — تاحشر جو لحد سے اٹھایا نہ جائے گا
ہم اپنے گرد وپیش کو مہکائیں گے ضرور — خوشبو کو خاک میں تو ملایا نہ جائے گا
مومن بجائے خود ہی علامت ہے نور کی — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
جن کی رگوں میں روغن زیتون ہے رواں — مومن ہے وہ دیا جو بجھایا نہ جائے گا

سالکؔ کی بات ، رحمت عالم کی بات ہے
مشرک کو اپنا یار بنایا نہ جائے گا

☆☆

اخبار جامعہ

جامعہ سلفیہ بنارس میں ماہ محرم کے فضائل واحکام

کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ

جامعہ سلفیہ بنارس کے شعبۂ دعوت وارشاد نے بنارس اور مضافات کے مختلف علاقوں میں دعوتی پروگراموں کے انعقاد کے ساتھ اندرون جامعہ بھی علمی ودعوتی مجلسوں پر توجہ دی ہے۔

چنانچہ مورخہ ۱۸ جنوری ۲۰۰۸ء مطابق ۸ محرم ۱۴۲۹ھ بروز جمعہ بعد نماز مغرب جامعہ سلفیہ کے لکچر ہال میں جامعہ سلفیہ کے صدر فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری حفظہ اللہ کی صدارت میں ''ماہ محرم کے فضائل واحکام'' کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ کا انعقاد ہوا جس میں ماہ محرم اور اس سے متعلقہ گوشوں پر روشنی ڈالی گئی نیز مروجہ بدعات وخرافات کی نشاندہی کی گئی، اس مجلس کا آغاز جامعہ سلفیہ کے ایک طالب علم محمد مستقیم (تجوید سال دوم) نے قرآن کریم کی آیت: ﴿إن عدة الشهور عند الله .... مع المتقين﴾ (توبہ:۳۶) کی تلاوت سے کیا۔

اس کے بعد برادرم کلیم اللہ ف ۲ نے ایک نظم پیش کیا اور پھر باضابطہ مذاکرہ علمیہ کا آغاز ہوا، متعین خطباء میں سب سے پہلے فضیلۃ الشیخ مولانا عزیز الرحمن صاحب سلفی حفظہ اللہ نے ''یزید بن معاویہ سے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا جائزہ'' کے عنوان کے تحت ادلۂ احادیث سے اپنے موضوع کی وضاحت کی اور ثابت کیا کہ یزید بن معاویہ متبع سنت اور نیک خلیفہ تھے، ان کی بیعت پر پورا شام، مکہ، مدینہ اور کوفہ متفق تھا جس میں صحابہ کرام کی وافر تعداد تھی، اگر یزید دشمن اسلام ہوتے تو صحابہ کرام ان کی بیعت سے کیونکر متفق ہوئے اور کیونکر ان کے ساتھ شریک جہاد ہوئے؟ لہٰذا یزید بن معاویہ کے خلاف جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ بے بنیاد، بے اصل اور جھوٹی ہیں، نیز موصوف نے مخالفین وموافقین کے دلائل کا تجزیہ کر کے صحیح موقف کی توضیح فرمائی۔

اور اس کے بعد استاذ محترم فضیلۃ الشیخ مولانا عبید اللہ طیب صاحب مکی حفظہ اللہ نے اپنے موضوع ''محرم اور عاشوراء کے فضائل ثابتہ وغیر ثابتہ'' کی توضیح فرماتے ہوئے آیات قرآن اور احادیث صریحہ صحیحہ سے یہ ثابت کیا کہ امت محمدیہ کو دسویں

محرم (عاشوراء کے دن) کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اور اس روزے کی فضیلت یہ بیان کیا کہ رمضان کے بعد محرم کا روزہ رکھنا افضل ہے اور اس سے گذشتہ ایک سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

محاضرے کے تیسرے اور آخری خطیب فضیلۃ الشیخ مولانا اسعد اعظمی حفظہ اللہ تھے، آپ نے ''بدعات محرم مختلف مسالک کے علماء کی نظر میں'' نہایت دلچسپ اور مدلل گفتگو کی اور فرمایا کہ ہندوستان میں سنی جماعتوں (اہل حدیث ، دیوبندی وبریلوی) میں جہاں مسلکی اختلافات ہیں وہیں کچھ اشتراکات بھی ہیں، چنانچہ آپ نے دیوبندی مکتب فکر کے اکابر علماء مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالحئی لکھنوی کے فتاوی سے ماہ محرم میں مروجہ بدعات کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہوئے بریلوی مکتب فکر کے بڑے عالم مولانا احمد رضا خاں کے اقوال وفتاوی کو بھی خلاف بدعات محرم ذکر کیا، مزید آپ نے کہا کہ ہر مذہب ومسلک میں کوئی نہ کوئی حق کے متلاشی رہتے ہیں، چنانچہ جماعت شیعہ میں بھی ایسے لوگ موجود رہے جو اپنے بہت سے مسلکی افعال کے منکر تھے، ان میں قابل ذکر ڈاکٹر موسی الموسوی اور ان کے دادا کے نام کو شمار کراتے ہوئے اپنے موضوع پر سیر حاصل بحث فرمائی۔

اس کے بعد مجلس کے صدر فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری حفظہ اللہ نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے اس مجلس کی افادیت اور ہر خاص وعام کو اس سے مستفید ہونے پر زور دیا۔

سامعین میں اساتذۂ کرام اور طلبۂ جامعہ کے علاوہ شہر کے لوگ بھی موجود رہے، اور سبھی حضرات علماء کرام کی باتوں سے مستفید ہوئے ، یہ مذاکرۂ علمیہ اس حیثیت سے بھی اہمیت کا حامل تھا کہ ایک ہی موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہونے کے ساتھ مجلس کے اختتام پر سوال وجواب کا موقع بھی اس میں شامل تھا۔

تقریبا دو گھنٹے چلنے والے اس پروگرام کی نظامت کا فریضہ فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالکبیر صاحب مبارکپوری حفظہ اللہ نے انجام دیا۔

اللہ رب العزت تمام محاضرین کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں صحت وعافیت، امن واطمینان سے نوازے، آمین۔

کتبہ: عمار یاسر عطاء الرحمٰن سلفی



باب الفتاوی

کیافرماتے ہیں علماءدین ان مسائل کے بارے میں کہ:

س (۱) سلام مین پہل کیسے کرنا چاہئے۔اورسلام کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

ج (۱) آپ ﷺ کاارشاد ہے ''چھوٹا بڑے کو، راہ چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، سوار پیدل کو، اورتھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کوسلام کریں''، الفاظ حدیث یوں ہیں: "عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: يسلم الصغير على الكبير والمار على القاعد والقليل على الكثير" اورایک دوسری حدیث یوں مروی ہے: "عن أبي هريرة عن رسول الله ﷺ أنه قال: يسلم الراكب على الماشي، والماشي على القاعد، والقليل على الكثير"۔(بخاری، باب تسلیم القلیل علی الکثیر :۶۲۳۱، مسلم ۲۱۶۰)

آنحضور ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ چھوٹوں کوبھی سلام کیا کرتے تھے۔(بخاری:۶۲۴۷، مسلم ۲۱۶۸)

آنحضور ﷺ سے عورتوں کوسلام کرنا اوران کاجواب دینا بھی ثابت ہے۔(بخاری ۹۳۸، ۶۲۴۸، ابوداؤد۵۲۰۴)

سلام کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جس کوآپ ﷺ نے اس انداز میں فرمایا: "عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: لا تدخلون الجنة حتى تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتى تحابوا أَوَ لا أدلكم على شيء إذا فعلتموه تحاببتم؟ أفشوا السلام بينكم" ''تم جنت میں اس وقت تک نہیں جاسکتے جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ، اورتم اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو، کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں کہ جب تم اسے اختیار کروگے تو آپس میں محبت کرنے لگوگے۔(اوروہ یہ ہے کہ) تم آپس میں سلام کو پھیلاؤ (مسلم ۱/۸۰، ۸۱، باب نمبر۲۲ ح ۵۴، ابوداؤد ۵۱۹۳)

س (۲) کسی دوسرے کے کمرے یاگھر جانے پر اجازت کا کیا طریقہ ہونا چاہئے!

ج (۲) کسی کے گھریا کمرہ جانے سے پہلے ہمیں وہ طریقہ اپنانا چاہئے جس کی تعلیم ہماری شریعت نے دی ہے۔اوروہ یہ ہے کہ کسی کے یہاں جانے پرسب سے پہلے سلام کرنے کے بعد تین دفعہ اجازت طلب کرنی چاہئے (مسلم ۲۱۵۳، ابوداؤد، باب کم مرة یسلم الرجل في الاستئذان:۵۱۸۰) حضرت کلدہ بن حنبل بیان کرتے ہیں کہ: ''میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور سلام کئے بغیر ہی اندر داخل ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: واپس لوٹ جاؤ اوراس طرح کہو: ''السلام علیکم، کیا میں اندر آجاؤں (ابوداؤد، باب کیف الاستئذان:۵۱۷۶) اجازت طلب کرتے وقت نظر دروازے سے الگ ذنی چاہئے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اجازت کا طلب کرنا اس لئے مشروع کیا گیا ہے تاکہ نامحرم پرنظر نہ پڑے، (مسلم ۱۷۹۸) اندر سے پوچھے جانے پر کہ

کون ہے تو، جواب میں ''میں'' یا ''ہم'' نہیں کہنا چاہئے بلکہ نام بتانا چاہئے۔(بخاری، باب إذا قال من ذا فقال أنا: ۶۲۵۰، مسلم ۲۱۵۵)

س(۳) کھانا کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینے کا کیا فائدہ ہے؟

ج(۳) کھانا کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینے کے بہت سارے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے اس انداز میں واضح فرمایا ''جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے اور داخل ہونے اور کھانے کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے: (یہاں) تمہارے لئے نہ رات گذارنے کی جگہ ہے اور نہ رات کا کھانا اور جب داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کہتا ہے تمہیں (یہاں) رات گذارنے کا ٹھکانا مل گیا ہے جب کھانے کے وقت بھی اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کہتا ہے کہ تم کو رات گذارنے کا ٹھکانا اور کھانا دونوں مل گئے ہیں۔(مسلم: ۲۰۱۸، باب آداب الطعام والشراب وأحکامھما، ابوداؤد، باب التسمیۃ علی الطعام: ۳۷۶۵)

س(۴) کھڑے ہوکر کھانے اور پینے کا کیا حکم ہے، واضح فرمائیں۔

ج(۴) کھڑے ہوکر کھانے پینے سے ہمارے رسول جناب محمد ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''تم میں سے کوئی شخص ہرگز کھڑے ہوکر نہ پئے اور جو بھول کر پی لے تو اسے چاہئے کہ قئے کردے۔(مسلم، باب کراھیۃ الشرب قائما: ۲۰۲۶)

حضرت أنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے آدمی کو کھڑے ہوکر پانی پینے سے منع فرمایا ہے''۔

حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت أنسؓ سے پوچھا کہ کھڑے ہوکر کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ تو سب سے بدتر یا سب سے خبیث (عمل) ہے۔(مسلم، باب کراھیۃ الشرب قائما: ۲۰۲۴)

س(۵) پینے کی چیز کتنی سانسوں میں پیا چاہئے؟

ج(۵) پینے کی چیز کم سے کم تین سانسوں میں پیا چاہئے، حضرت أنسؓ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ پینے کی چیزیں تین سانس میں پیتے تھے (بخاری، کتاب الاشربۃ، مسلم، باب کراھیۃ التنفس فی نفس الاناء واستحباب التنفس ثلاثا خارج الاناء: ۲۰۲۸) یاد رہے کہ آپ ﷺ نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے۔(مسلم: ۲۶۷) اس لئے سانس لیتے وقت برتن سے منہ یا منہ سے برتن ہٹالینا چاہئے۔

الجواب صحیح	ہذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم
محمد رئیس ندوی	حررہ: ابوعفان نور الہدیٰ عین الحق سلفی مالدہی
جامعہ سلفیہ بنارس	جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس

☆☆☆